آرشیو
انتشارات
روابط بین الملل

استاد شهید
مرتضیٰ مطہری

اسلامی تصوّرِ کائنات کی تمہید

(حصّہ سوم)

وحی ونبوّت

۲۳۹

نام کتاب	(وحی اور نبوّت) (اسلامی تصورِ کائنات کی تمہید)
مصنف	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
مترجم	حجۃ الاسلام مولانا ارشاد علی نجفی مبارکپوری
نظرثانی	مسئول بخش اردو سازمان تبلیغات اسلامی
تعداد	۵,۰۰۰
طبع اوّل	محرّم الحرام ۱۴۰۷ھ
ناشر :	سازمان تبلیغات اسلامی روابط بین الملل
حجم	۲۱ × ۱۶
کاتب	محمد اشرف زمان
مطبع	چاپخانۂ سپہر

اسلامی تصوّرِ کائنات

کی تمہید ۞

درج ذیل حصوں پر مشتمل ہے

۱۔ انسان اور ایمان

۲۔ توحیدی تصورِ کائنات

۳۔ وحی و نبوت

۴۔ قرآن میں انسان

۵۔ معاشرہ اور تاریخ

۶۔ امامت اور رہبری

۷۔ زندگی جاوید (معاد)

آرشیو
۷۰۵
انتشارات
روابط بین الملل

آرشیو
انتشارات
روابط بین الملل

فہرست

عام رہنمائی ۱

ا۔ پیغمبروںؑ کے خصوصیات ۳

(الف) معجزہ 〃

(ب) عصمت ۴

(ج) پیغمبروںؑ اور خارق العادہ افراد کے درمیان فرق ۷

(د) رہبری ۸

(ہ) خلوص نیت ۱۰

(و) اصلاحِ معاشرہ ۱۲

(ز) مبارزہ وجہاد ۱۳

(ح) پیغمبروںؑ کا بشری پہلو ۱۴

(ط) صاحبانِ شریعت پیغمبرؑ ۱۵

۲۔ پیغمبروںؑ کے تاریخی کردار ۱۶

(الف) پیغمبروںؑ کا کردار حقیقت اور واقعیت کا 〃
سمجھانا اور ظاہری دنیا سے دور رکھنا تھا۔ 〃

(ب) فلسفہ مادیت تاریخ کی توجیہ کے مطابق پیغمبروںؑ ۱۷
کا کردار موجودہ حالت کو محفوظ رکھنا تھا۔ 〃

(ج) دین و مذہب طاقتوروں کو روکنے کے لیے ۱۸
کمزوروں کی اختراع ہے۔ 〃

(د) دین کے بارے میں مثبت و صحیح نظریات ۱۹
اور مذکورہ بالا نظریوں پر تنقید۔ 〃

۳۔ (انبیاء کی) نبوّتوں (اور ان کے) ۲۳
بھیجے جانے کا مقصد۔ 〃

(ا) پیغمبروںؑ کا مقصد ثنوی (دونوں طرف) تھا ۲۴

(ب) اصل مقصد، اجتماعی وحدت ہے، فردی ۲۵
اور فکری وحدت اس کا وسیلہ ہے۔ 〃

(ج) اصل مقصد وحدت فردی ہے اور ۲۶
اجتماعی وحدت اسکا مقدمہ اور وسیلہ ہے؟ 〃

(د) صحیح نظریہ اور مذکورہ بالا نظریات پر تنقید 〃

۴۔ ایک دین یا بہت سے دین؟ ۲۹

ختم نبوّت ۳۱

نبوّتوں کی تجدید کے اسباب ۳۲

۵۔ خاتمیت کا معجزہ ۴۶

ان لوگوں کے نظریات جو معجزہ کو بھی ایک بے معنی 〃
امر کی طرح سمجھتے ہیں اور پیغمبرِ اسلامؐ کیلئے قرآن کے 〃
علاوہ کسی اور معجزہ کے قائل نہیں ہیں۔ 〃

پیغمبرِ اسلامؐ کے قرآن مجید کے علاوہ دوسرے 〃

معجزات اور مذکورہ بالا نظریوں پر تنقید ۔۔ ″
معجزہ کی قدر و قیمت اور افادیت ۔۔ ۵۹
پیغمبرؐ اسلام کی ہدایت کا رُخ ۔۔ ۶۰
قرآن ۔۔ ۶۵
قرآن مجید کے بارے میں مسلمانوں کی عظیم کوشش ۔۔ ۶۶
قرآن کا اعجاز (معجزہ ہونا) ۔۔ ″
قرآنی اعجاز کے متعدّد پہلو ۔۔ ۶۷
قرآن کے الفاظ ۔۔ ۶۸
قرآن کے معانی و مطالب ۔۔ ۷۲
قرآن کے موضوعات ۔۔ ۷۵
قرآن کے مطالب کا پھیلاؤ ۔۔ ۷۸
قرآن میں خُدا کی ذات ۔۔ ۷۹
انسان کا خدا سے تعلّق و رشتہ ۔۔ ۸۰
قرآن، توریت اور انجیل ۔۔ ۸۱
۶۔ اسلام کی امتیازی خصوصیات ۔۔ ۸۳
جہاں بینی و جہاں شناسی کے ساتھ ۔۔ ۸۸
آئیڈیالوجی کا رابطہ و تعلق۔ ۔۔ ″
(الف) معرفت و شناخت کی پہچان ۔۔ ″
اسلام کی نظر سے ۔۔ ″
(ب) اسلامی جہاں بینی کے امتیازات ۔۔ ″
(ج) اسلامی آئیڈیالوجی کے امتیازات ۔۔ ۱۰۰
۷۔ پیغمبر اکرم صلّی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلّم ۔۔ ۱۱۲

عام رہنمائی : وحی اور نبوّت کا اعتقاد دنیا اور انسان کے بارے میں ایک قسم کے نظریہ سے پیدا ہوتا ہے یعنی تمام موجودات کیلئے رہنمائی کا اصول اور ہدایت عامہ اسلامی تصورِ کائنات کا لازمہ ہے اور اس لحاظ سے اصل نبوّت اس تصورِ کائنات کا لازمہ ہے۔ خداوند عالم اس اعتبار سے کہ واجب الوجود بالذّات ہے اور واجب الوجود بالذّات تمام جہتوں سے واجب ہے، وہ علی الاطلاق (بلا کسی قید و شرط) فیض پہنچانے والا ہے اور انواع و اقسام موجودات کی ہر نوع پر جس حد تک ممکن و مناسب ہے اپنا فضل و کرم جاری رکھتا ہے اور تمام موجودات کی، ان کے کمال کی راہ میں رہنمائی فرماتا ہے، یہ ہدایت تمام موجودات کو شامل ہے چاہے وہ موجود چھوٹے سے چھوٹا ذرہ ہو یا بڑے سے بڑا ستارہ اور چاہے وہ پست ترین بے جان موجود ہو یا بلند ترین اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ موجود ہو اس کا فضل و کرم ان سب کو شامل ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن نے لفظِ وحی کو جس طرح انسانوں کی ہدایت کے لیے استعمال کیا ہے اسی طرح جمادات و نباتات و حیوانات کی ہدایت کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔

اس دنیا میں کوئی موجود بھی ایک جگہ اور ایک حالت میں ثابت اور قائم نہیں ہے بلکہ ہمیشہ وہ اپنی منزل و مقام کو بدلتی رہتی ہے اور اپنے مقصد و منزل کی طرف رواں دواں رہتی ہے۔ دوسرے رخ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تمام علامتیں اس امر کی نشان دہی کرتی ہیں کہ ہر موجود میں کسی مقصد کی طرف ایک طرح کا میلان اور ایک قسم کی کشش پائی جاتی ہے جس کی طرف وہ موجود سرگرم سفر رہتا ہے، یعنی تمام موجودات ان پوشیدہ قوتوں کے ذریعہ جو ان کے اندر پنہاں ہیں اپنے مقصد اور اپنی منزل کی طرف کھنچی چلی جاتی ہیں، یہ (غیر مرئی) قوت وہی ہے جس سے "الٰہی ہدایت" مراد لی

جاتی ہے۔ قرآن مجید حضرت موسیٰ کا قول نقل کرتا ہے جو آپ نے اپنے زمانہ کے فرعون سے کہا تھا "میرا پروردگار وہ ہے جس نے ہر شئی کو وہ وجود بخشا جو اس کے لائق تھا اور پھر اس موجود کو اس کی راہ پر آگے بڑھنے کی ہدایت کی" (۱)

ہماری دنیا ایک بامقصد دنیا ہے یعنی اس دنیا کی تمام موجودات کے اندر ترقی و کمال کی طرف بلند پروازی کی ایک کشش موجود ہے اور وہ مقصدیت وہی "الٰہی ہدایت" ہے لفظ "وحی" قرآن مجید میں مکرر وارد ہوا ہے، اس لفظ کے استعمال کی شکل اور اس کے استعمال کے مختلف مواقع سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن اس لفظ کو صرف انسان کے لیے محدود نہیں جانتا، بلکہ تمام اشیاء اور کم از کم زندہ موجودات میں اس لفظ کو جاری و ساری جانتا ہے اور اسی بنا پر شہد کی مکھی کی ہدایت کے موقع پر بھی لفظ وحی استعمال کیا ہے، یہ اور بات ہے کہ وحی و ہدایت کے درجات موجودات کی ترقی و تکامل کے اعتبار سے متفاوت و جداگانہ ہیں۔

وحی کا بلند ترین درجہ وہی ہے جو پیغمبروں کے سلسلہ سے ہوتا ہے، یہ وحی اس ضرورت کی بنیاد پر ہے جو نوع انسانی کو ہدایت الٰہی کی ہوتی ہے جو ایک طرف تو اس منزل مقصود کی طرف بشر کی رہنمائی کرتی ہے جو تمام محسوسات اور مادیات سے بالاتر ہے اور جو خواہ نخواہ بشر کی گذرگاہ ہوگی اور دوسری طرف اُس اجتماعی زندگی میں جس کے لیے ہمیشہ ایک ایسے قانون کی ضرورت ہے جو الٰہی ضمانت کی حامل ہو بشر کی حاجت کو پورا کرتی ہے۔ اس سے پہلے مکتب اور آیڈیالوجی کی بحث میں بیان کر چکے ہیں کہ انسان کو ایک صحیح اور کامل آیڈیالوجی کی ضرورت ہے اور وہ خود اس کی تنظیم اور تدوین سے ناتوان ہے انبیاؑ، بشریت کے لیے ایک ایسی مشین کی حیثیت رکھتے ہیں جو صحیح اور نجات دہندہ پیغامات کو اخذ کر کے سماج کے وسیع فضا میں پہنچا دیتے ہیں انبیاؑ وہ برگزیدہ افراد ہیں جو صحیح آیڈیالوجی کی تدوین کے لیے عالم غیب سے صلاحیت پاتے ہیں اور اس صلاحیت کو صرف خدا جانتا ہے اور بس، قرآن مجید آواز دے رہا ہے "اللہ یعلم حیث یجعل رسالتہ" (۲)

(۱) "ربنا الذی اعطیٰ کل شیٔ خلقہ ثم ھدٰی" طٰہٰ آیت ۵۰

(۲) سورۂ انعام آیت ۱۲۴

یعنی خدا خود بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کو کس محل و مقام میں قرار دے" اگرچہ وحی کی حقیقت کا سمجھنا ظاہری حواس اور افرادِ بشر کے تجربہ کے دائرے سے قطعاً خارج ہے لیکن اس قوت کو دوسری بہت سی قوتوں کے مانند اس کے آثار اور اس کی نشانیوں سے پہچانا جا سکتا ہے، وحیِ الٰہی، حاملِ وحی یعنی پیغمبر کی شخصیت میں بہت حیرت انگیز طریقہ سے اثر انداز ہوتی ہے، (وحی) حقیقت میں اس کو "مبعوث" و برانگیختہ کرتی ہے یعنی اس کی قوتوں کو ابھارتی ہے اور اس کے اندر ایک عظیم اور گہرا انقلاب پیدا کر دیتی ہے اور یہ انقلاب بشریت کی بھلائی، رُشد و ہدایت اور اصلاح و درستگی کی سمت میں ظاہر و نمودار ہوتا ہے اور پوری بصیرت کے ساتھ عمل کرتا ہے اور پیغمبر کے اندر ایک بے مثل و بے نظیر قاطعیت و یقین کی کیفیت پیدا کرتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ تاریخ ہرگز ایسے یقین و اطمینان کی مثال نہیں پیش کر سکتی جیسا یقین و اطمینان پیغمبروں کو اور ان لوگوں کو حاصل تھا جو اُن پیغمبروں کی تبلیغ اور ان کے وسیلہ سے اُبھارے گئے ہیں۔

(۱) **پیغمبروں کے خصوصیات:** الٰہی پیغام لانے والے جو وحی کے ذریعہ مبدءِ وجود (پروردگارِ عالم) سے رابطہ پیدا کرتے ہیں بہت سے امتیازی صفات اور خصوصی اوصاف سے آراستہ ہوتے ہیں جنکی طرف یہاں اشارہ کیا جاتا ہے۔

اعجاز: معجزہ پیش کرنا۔ جو پیغمبر خدا کی جانب سے مبعوث ہوتا ہے وہ عام عادت سے بالاتر قدرت و طاقت کا حامل ہوتا ہے اور اس خارق العادۃ قدرت و طاقت کے ذریعہ کوئی ایک یا کئی ایسے امور ظاہر کرتا ہے جو بشری طاقت و قدرت سے بالاتر ہوتے ہیں اور جو اس امر کی نشان دہی کرتے ہیں کہ ان امور کا ظاہر کرنے والا اُس خدائی خارق العادۃ طاقت کا حامل ہے اور یہ امور اس پیغمبر کی دعوت کے حق ہونے اور اس کی باتوں کے آسمانی ہونے کے گواہ ہیں۔

ان خارق العادۃ امور (معجزات) کے آثار کو جنھیں پیغمبروں نے باذنِ خدا اپنے دعوے کی سچائی پر گواہی کے طور پر پیش کیا ہے قرآن مجید "آیت" یعنی نبوّت کی علامت اور نشانی کہتا ہے اور اسلامی متکلمین ان امور کو اس لحاظ سے کہ یہ علامتیں تمام افرادِ امّت کی عاجزی اور ناتوانی کو ظاہر کرتی ہیں، معجزہ کہتے ہیں، قرآن مجید نقل کرتا ہے کہ ہر زمانہ کے لوگوں نے اپنے اپنے زمانہ کے پیغمبروں سے "نشانی" اور معجزہ طلب کیا ہے اور ان پیغمبروں نے اس تقاضا اور خواہش کا (جو ایک معقول اور منطقی تقاضا تھا کیونکہ یہ تقاضا حقیقت کی تلاش کرنے والے لوگوں کی طرف سے ہوتا تھا اور ان لوگوں کے لیے سوائے اس امر (معجزہ) کے کوئی دوسری صورت اُس پیغمبر کی نبوّت کی پہچان کی نہیں تھی) مثبت جواب دیا (اور معجزات دکھائے)۔ لیکن اگر معجزات کا تقاضا حقیقت کی تلاش کے سوا کسی اور مقصد سے ہوتا تھا مثلاً کسی معاملہ کی صورت میں وہ لوگ خواہش کرتے کہ اگر آپ فلاں کام انجام دے دیں تو اس کے بدلے میں ہم آپ کی دعوت پر لبیک کہیں گے اور اسے قبول کرلیں گے تو انبیاؑ کرام اس کام کے انجام دینے سے انکار کر دیتے تھے۔ قرآن مجید نے پیغمبروں کے بہت سے معجزات کو بیان کیا ہے مثلاً مُردہ کو زندہ کرنا اور مایوس و لاعلاج بیمار کو شفا دینا، گہوارہ میں باتیں کرنا اور عصا کو زندہ اژدہے کی شکل میں بدل دینا اور پوشیدہ اور آئندہ ہونے والی باتوں کی خبر دینا وغیرہ۔

عصمت : پیغمبروں کے مخصوص صفات میں سے "عصمت" ہے، عصمت یعنی گناہ اور خطا سے محفوظ رہنا یعنی انبیاؑ کرام نہ تو نفسانی خواہشات کے زیرِ اثر ہوتے ہیں جس کی وجہ سے گناہ کے مرتکب ہوں اور نہ اپنے کاموں اور فرائض کی ادائیگی میں خطاؑ و نسیان سے دوچار ہوتے ہیں، انبیاؑ کی گناہ اور خطاؑ سے دُوری ان حضرات کو اعتماد کی قابلیت کے بلند ترین درجہ پر پہنچا دیتی ہے ۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ان کی یہ محفوظیت کس طرح کی ہے ؟ مثلاً کیا ان کی عصمت اس طرح کی ہے کہ وہ جب بھی چاہیں کہ کسی گناہ یا غلطی کے مرتکب ہوں ایک غیبی طاقت

مجسّم ہوکران کے سامنے آجاتی ہے اورانھیں اس شفیق باپ کی طرح جواپنے بیٹے کولغزش سے منع کرتا ہے۔ روک دیتی ہے؟ یا اس طرح کی ہے کہ پیغمبروں کی سرشت (خمیر) یا خلقت اس طرح کی ہوتی ہے کہ ان سے نہ تو گناہ کا امکان ہے اور نہ غلطی کا؟ یعنی نہ وہ گناہ کرسکتے ہیں اور نہ کوئی خطا؟ بالکل ویسے ہی جیسے ایک فرشتہ زنا نہیں کرتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جنسی خواہش رکھتا ہی نہیں، یاایک حساب کی مشین (کمپیوٹر) حساب میں کبھی غلطی نہیں کرتی اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ذہن سے خالی و عاری ہے، (کیا نبی بھی اسی معنی سے معصوم ہوتا ہے؟)

یا پیغمبروں کے معصوم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ان حضرات کے مرتکب گناہ نہ ہونے اور خطا نہ کرنے کا اصل سبب انکی اعلیٰ بصیرت اوران کے یقین وایمان کا بلند درجہ ہے؟ بے شک ان تمام صورتوں میں یہی تیسری صورت صحیح ہے۔ اب ہم ان دو مذکورہ صورتوں کو علیحدہ علیحدہ ذکر کرتے ہیں۔

(۱) گناہ سے محفوظ رہنا:

انسان ایک با اختیار موجود ہے اور وہ اپنے کاموں کو فائدوں اور نقصانات، مصلحتوں اور خرابیوں کی بنیاد پر سمجھ بوجھ کریعنی ان باتوں کو پیش نظر رکھ کر منتخب کرتا ہے، اس لحاظ سے یہ "تشخیص" کاموں کے منتخب اوراختیار کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یعنی یہ امر محال ہے کہ انسان اس کام کواختیار کرے جواس کی تشخیص (سمجھ بوجھ) کے مطابق کسی طرح بھی اس کے لیے فائدہ مند نہ ہو، اسی طرح یہ بھی محال ہے کہ (اس کی تشخیص کے مطابق) جس کام میں اس کے لیے کسی قسم کا ضرر ونقصان ہو اسے منتخب اوراختیار کرے۔ مثلاً ایک عقل مند انسان جسے اپنی زندگی پیاری ہوجان بوجھ کر اپنے کو پہاڑ کی چوٹی سے نہیں گرائے گا یا زہر قاتل نہیں کھائے گا۔

لوگ اپنے ایمان اور گناہوں کے انجام کی طرف متوجہ ہونے کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت فرق رکھتے ہیں۔ ان کا ایمان جتنا زیادہ قوی ہوگا اور گناہوں کے انجام کی طرف جتنی زیادہ

توجہ ہوگی، گناہوں سے ان کا بچنا بھی اتنا ہی زیادہ اور گناہوں میں آلودہ ہونا اتنا ہی کم ہوگا، پس اگر ایمان کا درجہ عینی مشاہدہ کی (آنکھوں سے دیکھنے جیسی) حد تک پہنچ جائے، اس حد تک کہ آدمی گناہ کرنے کا ارادہ کرتے وقت اپنے کو اس حالت میں پائے کہ وہ اپنے کو دیدہ و دانستہ پہاڑ کے اوپر سے گرا رہا ہے یا زہر قاتل کھانے جا رہا ہے تو ایسے موقع پر گناہ میں آلودہ ہونے کا امکان صفر کے درجہ پر پہنچ جائے گا، یعنی آدمی ہرگز گناہ کی طرف رخ بھی نہیں کرے گا، ہم ایسی ہی حالت کو عصمت یعنی گناہوں سے محفوظیت کہتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ عصمت کمالِ ایمان اور شدّتِ تقویٰ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا انسان کو معصومیت و مصونیت (یعنی گناہوں سے محفوظ رہنے) کے درجہ پر فائز ہونے کے لیے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ایک خارجی وغیبی قوّت جبراً اسے گناہ سے باز رکھے یا معصوم شخص اپنی خلقت و سرشت کی بنا پر ایسا ہو کہ اس سے گناہ کی قوّت یا خواہش ہی چھین لی گئی ہو۔ اگر کوئی انسان گناہ پر قادر ہی نہ ہو یا کوئی جبری طاقت اس کو گناہ سے برابر روکتی رہتی ہو تو ان دونوں صورتوں میں اس کا گناہ نہ کرنا کوئی کمال شمار نہیں ہوگا کیونکہ ان حالات میں وہ اس انسان کی طرح ہوگا جو کسی قید خانہ میں مقید ہو اور کوئی خلافِ قانون کام کرنے پر قادر ہی نہ ہو تو ایسے انسان کا نافرمانی نہ کرنا اس کی نیک کرداری اور امانت کی دلیل نہیں بن سکتا۔

(۲) **خطا و غلطی سے محفوظ ہونا:** خطا سے پاک ہونا بھی پیغمبروں کی اعلیٰ بصیرت ہی کی پیداوار ہے، خطا ہمیشہ اس صورت میں سرزد ہوتی ہے کہ انسان ایک اندرونی یا باہری حس کے ذریعہ سے کسی واقعی چیز کیساتھ لگاؤ اور دلچسپی پیدا کرتا ہے اور اس کی وجہ سے ذہنی شکلوں کا ایک سلسلہ اپنے ذہن میں جمع کرتا ہے پھر اپنی عقل کی قوّت سے ان شکلوں میں تجزیہ اور ترکیب عمل میں لاتا ہے اور بھی بہت سے تصرفات ان میں کرتا ہے، اس وقت ان ذہنی شکلوں کو خارجی واقعیتوں سے مطابقت کرنے اور ان صورتوں کو ترتیب

دینے میں کبھی کبھی اس سے خطا واقع ہو جاتی ہے ، لیکن جہاں انسان براہِ راست عینی واقعیتوں کے ساتھ ایک خاص حس کے ذریعہ سے مواجہ رہتا ہے اور واقعیت کا ادراک اس کے لیے عین واقعیت سے ماُخوذ ہو نہ کہ ذہنی صورت کو واقعیت سے مطابق ومتصل کرنا   تو اس مقام پر خطاُ واشتباہ اور غلطی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ پیغمبرانِ الٰہی باطنی طور پر ہستی کی واقعیت سے رابطہ واتصال رکھتے ہیں لہٰذا واقعیت کے ادراک میں ان سے غلطی فرض بھی نہیں کی جا سکتی ۔ مثلاً ہم تسبیح کے سو دانوں کو کسی برتن میں رکھ دیں اور پھر دوسرے سو دانے بھی اسی برتن میں رکھ دیں اور سو مرتبہ اس عمل کو تکرار کریں ۔ تو ممکن ہے کہ ہمارا ذہن خطا کر جائے اور ہم یہ خیال کرنے لگیں کہ ہمارا یہ عمل ۹۹ مرتبہ ہوا ہے یا ایک سو ایک مرتبہ رونما ہوا ہے ، لیکن یہ محال ہے کہ اصل واقعیت میں کمی یا زیادتی ہو اور سو سو دانوں کو سو بار برتن میں رکھنے کی بنا پر ان سب دانوں کی واقعی تعداد میں کمی یا زیادتی واقع ہو ۔

اسی طرح وہ انسان جو اپنے علم وآگاہی کے لحاظ سے   واقعیت کی حقیقت سے واقفیت رکھتے ہیں اور جو وجود اور اس کے جریان کی بیخ وبُن سے متحد ومتصل ہوتے ہیں ان کے یہاں اشتباہ کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی اور وہ سب معصوم ومحفوظ ہونگے ۔

پیغمبروں اور خارق العادۃ افراد کے درمیان فرق

یہیں سے اس فرق کا بھی پتہ لگایا جا سکتا ہے جو پیغمبروں اور ماہرینِ فنون کے درمیان ہوتا ہے اس لیے کہ ماہرین ومدبّرین وہ افراد ہوتے ہیں جو فکری وتعقلی وحسابگری (یعنی سوچ بچار اور حساب کرنے) کی قوّت بہت تیز اور بہت زیادہ رکھتے ہیں یعنی اپنے حواس کے ذریعہ چیزوں کی حقیقت معلوم کر لیتے ہیں اور اپنی عقل کی حساب کرنے والی قوّت کے ساتھ اپنے ذہن سے پیدا کیے ہوئے مواد سے کام لیتے ہیں اور نتیجہ حاصل کر لیتے ہیں مگر کبھی کبھی نتیجہ نکالنے میں غلطی بھی کر جاتے ہیں ۔

پیغمبرانِ الٰہی اپنی عقل وخرد، فکر واندیشہ اور ذہنی حساب گری کی طاقت سے مستفید ہونے کے علاوہ ایک دوسری قوّت سے بھی جس کا نام وحی ہے بہرہ اندوز ہوتے ہیں اور ماہرین کو یہ طاقت میسّر نہیں ہے اور اسی وجہ سے کسی صورت سے بھی ماہرین کو پیغمبروں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ مقائسہ و مقابلہ اس وقت ہوتا جب کہ دونوں گروہ کے کام ایک نوع اور ایک طرح کے ہوتے، لیکن جب دونوں کے کام اور طریقۂ کار جداگانہ ہیں تو دونوں کا ایک دوسرے پر قیاس غلط ہوگا۔ مثلاً یہ صحیح ہے کہ دونوں کی دیکھنے کی قوّت، سننے کی قوّت یا فکری قوّت کے بارے میں ایک دوسرے پر قیاس کریں، لیکن یہ قطعاً صحیح نہیں ہوگا کہ ایک کی قوّتِ بینائی کو دوسرے کی قوّتِ سامعہ پر قیاس کریں اور یہ کہیں کہ اس اعتبار سے ان میں سے فلاں زیادہ طاقت ور ہے۔ ماہرین و مدّبرین کی مہارت و تدبیر کا تعلّق ان کی بشری فکری و اندیشہ کی قوّت سے ہے اور پیغمبروں کے فوق العادۃ امور کا تعلّق اس قوّت سے ہوتا ہے جس کا نام وحی ہے اور مبدءِ وجود (خداوندمتعال) سے اس کے ذریعہ اتصال ہوتا ہے لہٰذا ان دونوں شخصیّتوں کا ایک دوسرے پر قیاس کرنا غلط ہوگا۔

رہبری

رسالت و پیغمبری کا آغاز اگرچہ خدا کی طرف معنوی و باطنی سفر اور ذاتِ خدا سے قربت حاصل کرنے اور خلقِ خدا سے قطع تعلق (سیر من الخلق الی الحق خلق سے حق کی طرف سفر) سے ہوتا ہے جس کا لازمی نتیجہ ظاہر سے روگردانی اور باطن (کی اصلاح) کی طرف متوجہ ہونا ہے، لیکن حقیقت میں اس کا سرانجام و نتیجہ انسانی زندگی کی اصلاح اور اجتماعی نظام قائم کرنے اور ایک صحیح راستہ کی طرف انسان کی ہدایت کے پیشِ نظر بمصداق (سیر بالحق لخلق الی الخلق حق کے ساتھ خلق کی طرف سفر) خلق اور ظاہر کی طرف واپسی ہوتا ہے۔

لفظ "نبی" عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "خبر لانے والا" فارسی میں لفظ "پیامبر" یا پیغمبر اسی معنی کو ادا کرتا ہے اور لفظ "رسول" عربی لفظ ہے جس کے معنی "فرستادہ" یعنی بھیجا ہوا ہے۔

پیغمبر، الٰہی پیغام کو خلقِ خدا تک پہنچاتا ہے اور ان کی مخفی قوّتوں کو بیدار کرتا ہے اور اس کے لیے اسباب مہیا کرتا ہے اور خدا کی طرف اور ان چیزوں کی طرف جو خداوند عالم کی رضا و خوشنودی کا باعث ہیں مثلاً صلح و صاف دلی، اصلاح کی خواہش، کسی کو تکلیف نہ دینا، ضرر و نقصان نہ پہنچانا غیرِ خدا سے آزادیٔ سچائی، شائستگی و درستی، محبتِ آپس میں ہمدردی، عدالت اور تمام اخلاقِ حسنہ اور اچھے عادات و اوصاف کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا ہے اور بشریّت کو خواہشاتِ نفسانی اور تمام اقسام کے بتوں اور طاغوتوں کی اطاعت کی زنجیر سے رہائی بخشتا ہے۔

علامہ اقبال (لاہوری) نے انبیاء اور ایسے تمام افراد جو (عرفا) خدا کی راہ اختیار کیے ہوئے ہیں لیکن انھیں پیغمبری کا منصب نہیں ملا ہے کے درمیان فرق ظاہر کرتے ہوئے ایسے مذکورہ افراد کو "مرد باطنی" کا نام دیا ہے چنانچہ وہ بیان کرتے ہیں:

"باطنی انسان اس سکون و اطمینان کے حاصل ہو جانے کے بعد جسے وہ (اپنے معنوی و باطنی سفر میں) پیدا اور حاصل کرتا ہے یہ نہیں چاہتا کہ وہ پھر اس دنیاوی زندگی کی طرف واپس آئے۔ لیکن ایسے وقت میں جبکہ وہ کسی شدید ضرورت کی بنا پر اس دنیاوی زندگی میں واپس آبھی جاتا ہے تو اس کی یہ واپسی جامعۂ بشریّت کے لئے کوئی خاص فائدہ مند نہیں ہوتی، لیکن پیغمبر کی (دنیاوی زندگی کی طرف) واپسی خلاقیّت کا پہلو رکھتی ہے اور نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ (پیغمبر) واپس ہوتا ہے اور معاشرہ میں وارد ہوتا ہے۔ مگر اس کی واپسی اس مقصد سے ہوتی ہے کہ وہ تاریخ کے بہاؤ کو اپنے اختیار میں کرلے اور پھر اس طریقہ سے کمال مطلوبات کی ایک نئی دنیا آباد کرے۔ مرد باطنی کے لیے سکون کا حاصل ہو جانا ہی انتہائی و آخری منزل ہے، لیکن پیغمبر کے لیے اس کی روح شناسی کی قوّت کا بیدار ہونا (آخری منزل ہے)، جس کے ذریعہ وہ دنیا کو ہلا دیتا ہے اور یہ طاقتیں ایسی ہوتی ہیں کہ بشری دنیا کو مکمل طور سے بدل کر رکھ دیتی ہیں۔" (۱)

اس بنا پر خلقِ خدا کی رہبری اور اسباب کی فراہمی اور انسانی قوّتوں کو خدا کی رضا و خوشنودی اور

(۱) احیاء فکرِ دینی در اسلام۔ ترجمۂ احمد آرام ص ۱۴۳۔

بشریّت کو صلاح و فلاح کے لیے اُبھارنا اور حرکت میں لانا پیغمبری کا ایسا جزو لازم ہے جسے اس سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

خلوصِ نیّت

پیغمبرانِ الٰہی اس لحاظ سے کہ وہ خدا پر مکمل اعتماد و بھروسہ رکھتے ہیں اور اس بات کو کبھی نہیں بھولتے کہ انھیں خداوند متعال کی طرف سے ایک منصبِ اعلیٰ (فریضۂ رسالت) عطا کیا گیا ہے اور وہ اس رسالت کے فرائض کو ادا کررہے ہیں۔ وہ اپنے اس فریضہ کی ادائیگی میں انتہائی خلوص برتتے ہیں۔ یعنی بشر کی ہدایت جو مطلوبِ خدا ہے کے سوا ان کا کوئی دوسرا مقصد و مطلب نہیں ہوتا، (حتّٰی کہ وہ) لوگوں سے رسالت کا کام انجام دینے کی اجرت و مزدوری بھی نہیں چاہتے۔

قرآن مجید نے سورۂ الشعرآء میں بہت سے پیغمبروں کے اقوال کو جو انھوں نے اپنی اپنی قوموں کے سامنے پیش کئے ہیں بطور خلاصہ نقل کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہر پیغمبر نے ایک مشکل یا بہت سے مشکلات کی مناسبت سے جن سے وہ حضرات تبلیغ رسالت کے سلسلہ میں دوچار ہوئے جداگانہ نوعیت کے پیغامات اپنی اپنی قوم کو دئے لیکن ایک مفہوم جو تمام پیغمبروں کے پیغام میں مکرّر اور بار بار آیا ہے وہ یہ ہے کہ" میں (تبلیغ رسالت کی) اجرت و مزدوری کا تم سے خواہش مند نہیں ہوں"

لہٰذا یہ خلوصِ نیّت بھی پیغمبری و نبوّت کے مشخصات اور امتیازی خصوصیات میں سے ہے اور اسی وجہ سے پیغمبروں کا پیغام ہمیشہ ایک بے نظیر قاطعیت (یقین و اطمینان) کے ساتھ ہمراہ تھا اور اب بھی ہے۔ پیغمبرانِ خدا اس لحاظ سے کہ انھیں اس بات کا احساس رہتا تھا کہ وہ "مبعوث" ہیں (خلقِ خُدا کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے ہیں) اور وہ اپنی رسالت اور اس کی ضرورت اور اس کے نتیجہ بخش اور فائدہ مند ہونے کے بارے میں معمولی سے معمولی شک و تردّد نہیں رکھتے تھے، اسی لیے اس بے نظیر یقین و اطمینان کے ساتھ جسکی کوئی مثال نہیں مل سکتی وہ اپنے الٰہی پیغام کی تبلیغ کرتے تھے اور اس

کا دفاع بھی کرتے تھے۔

حضرت موسیٰ بن عمران اپنے بھائی ہارونؑ کو ساتھ لے کر اس حالت میں کہ موٹا اونی لباس زیب تن کیے ہوئے اور لکڑی کا عصا ہاتھ میں لیے ہوئے تھے۔ بس (ان مبلغین کی، ظاہری شان وشوکت اسی حد تک محدود و منحصر تھی) فرعون کے پاس جاتے ہیں اور اس کو توحید الٰہی کی طرف دعوت دیتے ہیں اور مکمل یقین واطمینان کے ساتھ اس کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر تو نے ہماری دعوت کو قبول نہ کیا تو تیری حکومت کا خاتمہ قطعی و یقینی ہے اور اگر تو ہماری دعوت قبول کرے گا اور جس راستہ پر چلنے کے لیے ہم بلا رہے ہیں تو بھی آجائے گا تو ہم تیری عزّت کے ضامن ہیں، فرعون نے بڑے تعجّب کے ساتھ کہا کہ ذرا ان لوگوں کو دیکھو! یہ لوگ اپنی پیروی کی صورت میں میری عزّت کی ضمانت اور بصورتِ دیگر میری حکومت کے زوال وخاتمہ کی باتیں کرتے ہیں۔ (۱)

پیغمبر اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے بعثت کے ابتدائی برسوں میں جبکہ مسلمانوں کی کل تعداد شاید دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کی تعداد سے زیادہ نہیں رہی ہوگی ایک جلسہ میں جس کو تاریخ نے جلسۂ "یوم الانذار" کے نام سے اپنے دامن میں محفوظ رکھا ہے، بنی ہاشم کے بزرگوں کو جمع کیا اور اپنا الٰہی پیغام ان کے سامنے پیش کیا اور نہایت صراحت وقاطعیت کے ساتھ صاف صاف لفظوں میں انھیں خبر دی کہ "میرا دین عالمگیر ہوگا (ساری دنیا میں پھیلے گا)، اور تمہاری خوش نصیبی اسی میں ہے کہ تم میری دعوت قبول کرو اور میری پیروی اختیار کرو" ـــــ یہ بات اتنی بڑی اور ناقابل یقین معلوم ہوئی کہ اس جمعیت نے تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھنا شروع کردیا اور پھر بغیر کوئی جواب دیے وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔

جس وقت پیغمبر اکرمؐ کے چچا جناب ابوطالب نے قریش کا یہ پیغام جس کا مضمون یہ تھا کہ "ہم اس بات کے لیے تیار ہیں کہ انھیں (پیغمبرؐ کو) اپنا بادشاہ منتخب کرلیں، قوم کی حسین ترین لڑکی کو ان کی زوجیت میں دے دیں اور انھیں ہم اپنی قوم میں سب سے بڑا دولت مند شخص بنا دیں بشرطیکہ

(۱): نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۵

وہ جو کام کر رہے ہیں اور جو باتیں کہہ رہے ہیں ان سے باز آجائیں"۔ آنحضرتؐ تک پہنچا یا تو آنحضرتؐ نے جواب میں فرمایا " خدا کی قسم! اگر یہ لوگ میری ایک ہتھیلی میں آفتاب اور دوسری ہتھیلی میں ماہتاب لاکر رکھ دیں تب بھی میں اللہ کی طرف بلانے سے باز نہیں آؤں گا اور تبلیغِ پیامِ الٰہی سے دست بردار نہیں ہوں گا۔

بے شک! جس طرح گناہ اور خطاء سے عصمت و مصونیت انسانوں کی رہبری میں وحی کی قوت اور خدا سے رابطہ و اتصال سے مجہز ہونے کے لوازم و ضروریات میں سے ہے اسی طرح خلوص اور یقین و اطمینان کامل بھی پیغمبری کے لوازم و ضروریات میں سے ہے۔

اصلاحِ معاشرہ

انبیاء کرام جو انسانی قوتوں کو بیدار، منظّم اور حرکت میں لاتے ہیں ان کا یہ عمل صرف افراد اور جامعۂ بشری کی اصلاح و درستی کے لیے ہوتا ہے دوسرے الفاظ میں ان کا یہ سارا عمل بشری سعادت و خوش نصیبی کی غرض سے ہوتا ہے۔ یہ محال ہے کہ انکی یہ ساری زحمت فردِ انسانی کو فاسد و خراب یا انسانی معاشرہ کی تباہی کی سمت میں ہو۔ اس بنا پر اگر ایک پیغمبری کے مدعی کی دعوت کا اثر و نتیجہ انسانوں کو فاسد کرنا اور ان کی باطنی قوتوں کو بے کار کرنا یا انسانی معاشرہ کی تباہی و بربادی اور نوعِ بشر کا ترقی کے بجائے انحطاط اور اسکی تنزّلی ہو تو خود یہ باتیں اس امر کی یقینی اور روشن دلیل ہیں کہ یہ مدعی نبوّت اپنے دعوے میں سچا نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے یہاں ایک بہت عمدہ بات کہی ہے وہ کہتے ہیں:۔

ایک پیغمبر کی پہچان کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے اپنے پیرو کاروں میں انسانی قدروں کو کس حد تک اجاگر کیا ہے یعنی اُن انسانی قدروں کو آزمانا جو اس نے معاشرے میں ایجاد کیے ہیں اور اس ثقافت اور تمدّن کا جائزہ لینا جو اس کی رسالت کا مرہونِ منّت ہے۔ (۱)

(۱) : احیاءِ فکر دینی در اسلام۔ صفحہ ۱۴۳

مقابلہ اور جہاد : ہر قسم کے شرک، خرافات ولغویات، جہالتوں، توہمات، خود ساختہ خیالات وعقائد، ظلموں، زیادتیوں اور ستمرانیوں سے ٹکر لینا اوران سے مقابلہ کرنا بھی پیغمبری کے ایک مدعی کی رسالت کی سچائی کی علامتوں اور نشانیوں میں سے ہے یعنی محال ہے کہ ایک شخص جو خدا کی طرف سے واقعی پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہو اور اس کے پیغام میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات ایسی ہو جس سے شرک کی بُو آئے، یا وہ کسی ظالم وستمگر کی مدد کو دوڑ پڑے اور ظلم وجور و بدعنوانی وبے انصافی کی تائید کرے، یا شرکوں، جہالتوں، خرافات ولغویات اور ظالموں کے ظلم وجور کے مقابلہ میں سکوت وخاموشی اختیار کرے اور چپ چاپ دیکھتا رہے اور ان سے مقابلہ ومبارزہ، جنگ وجدال کے لیے نہ اٹھ کھڑا ہو۔

توحید، عقل اور عدالت تمام پیغمبروں کی دعوت کے اصول میں سے ہیں اور محض ایسے ہی افراد (جو مذکورہ اصول کے مطابق دعوت دیتے ہیں) کی دعوت، مطالعہ اور دلیل ومعجزہ کے مطالبہ کے قابل ہے، یعنی اگر کوئی شخص اپنے پیغام میں کوئی ایسی چیز پیش کرے جو توحید کے خلاف ہو یا اس حکم کے خلاف ہو جو تمام عقلوں کے نزدیک قطعی اور مسلّم ہو یا عدل کے خلاف اور ظلم کی تائید میں ہو تو ایسے شخص کا پیغام مطالعہ اور کسی دلیل کے مطالبہ کے لائق بھی نہیں ہے، جسطرح سے کہ ایک پیغمبری کا مدعی کسی گناہ یا اشتباہ وخطار کا مرتکب ہوجائے یا خلق خدا کی ہدایت ورہبری کی طاقت وسکت نہ رکھتا ہو اگرچہ اس ناتوانی کا سبب کوئی جسمانی عیب یا کوئی نفرت پیدا کرنے والی بیماری جیسے جذام وغیرہ ہو یا اسکی دعوت انسانوں کی اصلاح کے روش کے خلاف ہو تو ایسے شخص کا پیغام کسی دلیل ومعجزہ کے مطالبہ کے لائق نہیں ہے، اس بنا پر ایسے اشخاص (بہ فرض محال) اگر اعجاز گر بھی ہوں اور بہت سے معجزات بھی دکھلائیں،

پھر بھی عقل ان کی پیروی کو جائز قرار نہیں دیتی۔

پیغمبروں کا بشری پہلو : انبیاء و مرسلین جو تمام خارق العادۃ پہلو اور صفات کے حامل ہوتے ہیں بعنوان مثال معجزہ عصمت بے نظیر رہبری ، بے مثل اصلاح اور شرک وکفر وظلم وجور ، بے ہودہ افعال و اقوال کے مقابلہ میں بے نظیر مبارزہ وجنگ وجہاد وغیرہ ۔ ان سب کے باوجود وہ نوع بشر سے تعلق رکھتے ہیں یعنی بشر ہوتے ہیں اور تمام لوازمات بشر رکھتے ہیں ، دوسرے تمام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے ہیں سوتے ہیں ، راہ چلتے ہیں ، تولید مثل کرتے ہیں اور بالآخر وفات پا جاتے ہیں ، وہ تمام احتیاج اور ضرورتیں جو بشریت کا لازمہ ہیں ان کے لیے بھی ہوتی ہیں ، دوسرے تمام لوگوں کی طرح انبیاء مرسلین بھی تکالیف واحکام شرعیہ کے مکلّف و مؤظف ہیں اور وہ تمام شرعی ذمہ داریاں جو ان کے وسیلہ سے لوگوں پر عائد کی جاتی ہیں خود ان انبیاء و مرسلین سے بھی متعلق ہوتی اور ان پر لاگو ہوتی ہیں ، تمام حلال وحرام امور ان کے لیے بھی ہیں ، بلکہ کبھی کبھی تو کچھ سخت تر ذمہ داریاں ان حضرات سے متعلق ہو جاتی ہیں جیسے کہ حضرت رسول اکرمؐ پر تہجّد یعنی رات کے آخری حصہ میں بیدار رہ کر نماز شب (نافلہ شب) کا ادا کرنا واجب تھا ۔

پیغمبرانِ خدا اپنے آپ کو تکالیف واحکام سے ہرگز مستثنیٰ نہیں رکھتے تھے ، وہ حضرات دوسرے تمام لوگوں کی طرح بلکہ دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ خدا سے ڈرتے تھے اور دوسروں سے زیادہ خدا کی عبادت کرتے تھے ، نمازیں پڑھتے تھے ، روزے رکھتے تھے ، جہاد کرتے تھے ، زکوٰۃ دیتے تھے ، خلق خدا کے ساتھ احسان و بھلائی کرتے تھے ۔ اپنی اور دوسروں کی زندگی کے لیے تلاشِ معاش کرتے تھے ، زندگی میں دوسروں پر بوجھ نہیں بنتے تھے ۔

پیغمبروں اور عام لوگوں میں فرق صرف مسئلہ وحی اور وحی کے مقدمات اور لوازم میں ہوتا ہے ، وحی پیغمبروں کو بشریت سے خارج نہیں کرتی بلکہ وحی ان کو ایک انسان کامل کی حیثیت سے دوسروں کے لیے نمونہ بنا کر پیش کرتی ہے اور اسی دلیل سے وہ دوسرے تمام لوگوں کے پیشوا

اور رہبر ہوتے ہیں۔

صاحبان شریعت پیغمبر! الٰہی پیغام لانے والے (پیغمبر) بطور کلی دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ ایک گروہ جن کی تعداد کم ہے اُن پیغمبروں کا ہے جنھیں خود مستقل طور پر دستورات واحکام و قوانین کا ایک سلسلہ وحی کے ذریعہ سپرد کیا گیا اور انھیں مامور کیا گیا کہ ان قوانین واحکام کو لوگوں تک پہنچائیں اور ان ہی قوانین واحکام کی بنیاد پر لوگوں کو ہدایت کریں اور ان ہی کے مطابق لوگوں کو عمل کرنے کی تلقین و تاکید کریں۔ ان پیغمبروں کو قرآن کی اصطلاح میں "اولوالعزم" کہا جاتا ہے۔ ہمیں صحیح اور یقینی طور پر یہ نہیں معلوم ہے کہ اولوالعزم پیغمبروں کی تعداد کیا تھی۔ خصوصاً اس امر کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ قرآن مجید اس بات کو صاف و صریح الفاظ میں کہتا ہے کہ اس نے فقط بعض پیغمبروں کا تذکرہ کیا ہے۔ اگر قرآن مجید نے تمام پیغمبروں کا تذکرہ کیا ہوتا یا کم از کم اس کا دعوٰے کرتا کہ قرآن مجید میں تمام اہم پیغمبروں کا ذکر کیا گیا ہے تو ممکن تھا کہ قرآن مجید میں مذکور پیغمبروں میں سے اولوالعزم پیغمبروں کی تعداد معلوم کرلی جاتی، بہرکیف ہم اتنا جانتے ہیں کہ حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسٰیؑ اور حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اولوالعزم پیغمبر ہوئے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو احکام و قوانین کا ایک ایک سلسلۂ وحی دیا گیا ہے کہ انھیں لوگوں تک پہنچائیں اور ان ہی قوانین کی بنیاد پر لوگوں کی تربیّت کریں۔

دوسرا گروہ ان پیغمبروں کا ہے جو بذاتِ خود کوئی شریعت اور قوانین نہیں رکھتے تھے بلکہ محض اس شریعت اور ان قوانین کی تبلیغ و ترویج پر مامور تھے جو اس زمانہ میں موجود تھے۔ پیغمبروں کی اکثریت اسی گروہ سے تھی جیسے حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت یوشعؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت ہارون، حضرت زکریاؑ

اورحضرت یحییٰؑ یہ سب اسی دوسرے گروہ سے ہیں جنہیں اصطلاح میں نبی بھی کہا جاتا ہے)۔

(۲) پیغمبروں کے تاریخی اثرات وکردار ! پیغمبرانِ خداسلسلۂ تاریخ میں اپنا کوئی مثبت یا منفی

نقش واثر رکھتے ہیں ؟ یا بالکل بے اثر رہے ہیں ؟ اوراگر کوئی اثر رکھتے ہیں تو وہ مثبت ہے یامنفی؟

پہلا نظریہ یہ ہے کہ پیغمبرانِ الٰہی تاریخ میں ایک مؤثر کردار رکھتے ہیں اور وہ حضرات بالکل بےاثرو بے کردار انسان نہیں تھے، پیغمبرانِ خدا ماضی میں ایک عظیم ملّی وقومی طاقت کے مظہر رہے ہیں، ماضی میں ان طاقتوں کے مقابلہ میں جوزور وزر، طاقت و دولت کے بل بوتے پر وجود میں آتی تھیں، قومی وملّی طاقتیں صرف ان طاقتوں میں منحصر تھیں جوخاندانی، قبائلی، وطنی جذبات ومیلانات کے ماتحت ظاہر ہوتی تھیں اور قبیلوں کے سردار، قوموں کے سربرآوردہ افراد اس کے مظہر گنے جاتے تھے، اس کے علاوہ دوسری طاقتیں وہ تھیں جو اعتقادی وایمانی (مذہبی) رجحانات ومیلانات سے عالم وجود میں آتی تھیں اور جن کے مظہر انبیاء ومرسلین اور صاحبانِ اَدیان (دیندار لوگ) ہوا کرتے تھے۔

اس معاملہ میں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ پیغمبرانِ خدا مذہبی اقتدار کے پشتیبان ہونے کے ساتھ ایک طاقت رہے ہیں، گفتگو اس طاقت وقوّت کے عمل وکردار کے بارے میں ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں مختلف نظریات کا اظہار کیا گیا ہے۔

(الف) ایک گروہ نے اپنی عادت کے مطابق اپنی تحریروں میں ایک سادہ سا صغرٰی کبریٰ قائم کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے اور اس کے مدعی ہیں کہ پیغمبروں کا کردار منفی رہا ہے اور وہ اسطرح کہ پیغمبروں کے کام کا رُخ معنویّت وباطنیّت کی طرف اور دنیا کے مخالف سمت تھا۔ پیغمبروں کی تعلیمات کا مرکز دنیا سے روگردانی اور آخرت کی طرف توجہ دلانا تھا، باطن کو سنوارنا اور ظاہر سے آزاد ہوجانا، ذہنیّت کی طرف رغبت ومیلان اور عینیّت سے گریز کرنا تھا۔ اس اعتبار سے دین ومذہب

اور تمام پیغمبر جو اس طاقت کے مظہر ہوتے ہیں بشر کو دنیاوی زندگی سے مایوس و نا امید کرنے کی راہنمائی کرتے تھے اور جامعۂ بشریت کی ترقی کے لیے "بریک" کی مثال رکھتے تھے اور اس طرح تاریخ میں پیغمبروں کا کردار ہمیشہ منفی رہا ہے ۔ عام طور پر اس قسم کے نظریہ کا اظہار وہ لوگ کرتے ہیں جو روشن فکر ہونے کے دعویدار ہیں ۔

(ب) ۔ ایک دوسرا گروہ صاحبانِ ادیان کے کردار و اثر کو ایک دوسرے طریقہ سے منفی گردانتا ہے ، یہ لوگ پہلے گروہ کے برخلاف صاحبانِ ادیان کو طالبِ دنیا جانتے ہیں اور ان کے معنوی و باطنی آرائشں کے رخ کو (معاذ اللہ) ایک پُر فریب نقاب کی حیثیت سے سمجھتے ہیں ۔ ان کا دعویٰ ہے کہ پیغمبروں کا یہ رویہ ہمیشہ زبردست و طاقتور طبقہ کی حفاظت اور اسی طبقہ کے فائدہ کے لیے اور کمزور و مجبور طبقہ کے ضرر و نقصان و استحصال کے لیے ہوتا تھا اور جامعہ بشریت کے ترقی و تکامل کے مقابل میں رہا ہے ، یہ لوگ مدعی ہیں کہ تاریخ بھی دوسرے تمام موجوات کیطرح ایک طبیعی حرکت رکھتی ہے یعنی وہ حرکت جو اندرونی تضاد سے پیدا ہوتی ہے ۔

مالکیت و اقتدار کے وجود کے سبب معاشرہ دو باہم متنازع طبقوں پر منقسم ہوگیا ، حاکم اور فائدہ حاصل کرنے والا طبقہ ، محروم اور سودہ طبقہ ، حاکم طبقہ اپنے امتیازات کی حفاظت کی غرض سے ہمیشہ موجودہ صورت حال کے باقی رہنے کا طرفدار رہا ہے جدید آلات اور ٹکنالوجی کے جبری تکامل و ترقی کے باوجود وہ طبقہ چاہتا ہے کہ معاشرہ کو بس اسی حالت پر قائم رکھے اور ترقی نہ کرنے دے اور محکوم طبقہ آلات کی ترقی کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر چاہتا ہے کہ اس موجودہ صورت حال کو بالکل الٹ دے اور اس سے زیادہ کامل و مکمل صورت حال کو اس کی جگہ پر لائے ۔ حاکم طبقہ نے تین مختلف شکلوں میں اپنا کردار ادا کیا ہے ، دینداری ،حکومت ، دولت مندی ۔ دوسرے لفظوں میں اقتدار حکومت کا عامل ، زر و دولت کا عامل اور فریب کا عامل ۔ صاحبان ادیان کا کردار ، عوام کو غفلت و فریب میں رکھنا تھا ، یہ کردار ظالموں ، جابروں اور ناجائز طریقوں سے نفع حاصل کرنے

والوں کے مفاد میں ہے، صاحبانِ ادیان کا آخرت کی طرف لوگوں کو رغبت دلانے کا عمل حقیقی و واقعی طور پر نہیں تھا بلکہ یہ عمل ایک فریب کا نقاب تھا جو ان کی دنیا طلبی کے چہرہ پر اس غرض سے ڈالا گیا تھا تاکہ محروم انقلابی اور ترقی پذیر طبقہ کے ضمیر کو اپنا مسخّر و تابع کیا جا سکے۔ پس معلوم ہوا کہ اس لحاظ سے اربابِ ادیان کا تاریخی کردار منفی تھا کہ وہ ہمیشہ قدامت پسند طبقہ کا قوت بازو اور عوام کی موجودہ زبوں حالی یعنی صاحبانِ دولت و حکومت کا طرف دار اور ان کے مفاد کا محافظ رہا ہے۔

مارکسزم کا نظریہ تاریخ کی توجیہ میں یہی ہے، مارکسزم نظریہ کے مطابق تین عامل و سبب، دین، حکومت اور دولت مالکیت کے اصل ہمزاد اور پوری تاریخ میں عوامی حقوق کے خلاف اسباب رہے ہیں۔

(ج) کچھ دوسرے افراد ہیں جو مذکورہ بالا نظریوں کے خلاف ایک علیحدہ نوعیت سے تاریخ کی تفسیر کرتے ہیں، مگر اس کے باوجود دین و مذہب اور ان کے مبلّغین یعنی پیغمبروں کے کردار کو منفی رخ دیتے ہیں یہ لوگ دعوٰے کرتے ہیں کہ طبیعت کی ترقی و تکامل اور تاریخ کے تکامل کا قانون اس بنیاد پر استوار ہے کہ طاقتوروں کا غلبہ رہے اور کمزوروں اور مجبوروں کا خاتمہ ہو چنانچہ طاقتور گروہ تاریخ میں ترقی کرنے والے اور آگے بڑھنے والے اسباب رہے ہیں جبکہ ضعفأ اور مجبور لوگ توقف اور تنزّلی کا سبب تھے اور ہیں۔ دین و مذہب ضعیفوں، کمزوروں اور مجبوروں کی اختراع و ایجاد ہے تاکہ اس کے ذریعہ طاقت وروں کو کنٹرول کر سکیں۔ صلاح و درستی، محبت و رحم دلی، ہمدردی و تعاون وغیرہ کے مفہوموں کو، دوسرے لفظوں میں غلامانہ اخلاق کو ضعفأ یعنی مجبوروں اور تباہ حال لوگوں کے مفاد میں اور ترقی و تکامل کے خلاف اور طاقتور طبقہ یعنی ترقی پذیر اور ترقی و تکامل کے عامل طبقہ کے ضرر و نقصان کے لیے اختراع کیا ہے اور اسطرح طاقتوروں کے ضمیر کو اپنے زیر اثر قرار دیا اور ضعیفوں، کمزوروں کے ختم ہو جانے سے مانع اور نسلِ بشر کی اصلاح و بہتری کے لیے رکاوٹ بنے ہیں لہٰذا مذہب اور پیغمبر جو اس طاقت کے مظہر تھے، کا کردار اس لحاظ سے کہ وہ "غلامانہ اخلاق" کے طرفدار

اور "مالکانہ اخلاق" کے جو تاریخ اور معاشرہ میں ترقی وتکامل کے عامل وسبب ہیں مخالف تھے (ان کا کردار منفی تھا جرمنی کا مشہور مادہ پرست فلسفی نیتشہ اسی نظریہ کا حامی وطرفدار تھا۔

(د) مذکورہ بالا تین گروہوں کو چھوڑ کر دوسرے تمام گروہ یہاں تک کہ منکرینِ ادیان بھی ماضی میں پیغمبروں کے کردار کو مثبت اور مفید اور تاریخ کے تکامل وترقی کے سمت میں جانتے ہیں۔ ان گروہوں نے ایک طرف تو پیغمبروں کے اخلاقی واجتماعی تعلیمات کے مفاہیم کی سمت دوسری طرف تاریخی عینی حقیقتوں کی سمت توجہ کی ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ پیغمبرانِ الٰہی ماضی میں معاشروں کی اصلاح وبہبود اور ترقی وپیشرفت کے سلسلہ میں مستحکم بنیادی کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ بشری تمدن دو پہلو رکھتا ہے مادّی اور معنوی۔ تمدن یا سماج کا مادّی رخ اس کا فنّی اور صنعتی رخ ہے جو مختلف ادوار سے گذرتا اور ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا آجکل کے دور کی ترقی تک پہنچا ہے اور تمدن کا معنوی رخ انسان کے انسانی روابط سے متعلق ہے۔ یہ معنوی پہلو پیغمبروں کے تعلیمات کا مرہونِ منت ہے اور یہ تمدن کے معنوی پہلو کی نورانیت ہے جسکی نورافشانی سے اس کے تمام مادّی پہلوؤں کو بھی جگمگانے کا موقع مل جاتا ہے۔ بنابریں پیغمبروں کا کردار معنوی پہلو کو حدِ کمال تک پہنچانے میں بطورِ مستقیم ہے اور مادّی پہلو کے تکامل کے سلسلہ میں بالواسطہ ہے ان گروہوں کی نظر میں ماضی میں پیغمبروں کے تعلیمات کے مثبت کردار میں کوئی بات ہی نہیں ہے البتہ ان میں سے بعض گروہ ان تعلیمات کے مثبت کردار کو صرف ماضی کی حد تک محدود ومنحصر جانتے ہیں اور آجکل کے دور میں ان تعلیمات کے اثر کو غیر مفید سمجھتے ہیں، ان کا یہ دعویٰ ہے کہ علوم کی روزافزوں ترقی کی وجہ سے دینی تعلیمات اپنا افادی کردار کھو چکی ہیں اور آئندہ ان کی عدم افادیت اور واضح ہو جائے گی، لیکن دوسرے گروہ اس بات کے مدّعی ہیں کہ ایمان اور مذہبی نظام کا کردار ایسا کردار ہے کہ علمی ترقی کبھی اس کی جگہ نہیں لے سکتی جس طرح فلسفی مکاتب بھی آج تک اس کے قائم مقام نہیں ہو سکے — ان مختلف کرداروں کے درمیان جو پیغمبروں نے ماضی میں ادا کیے ہیں کہیں کہیں اور کبھی کبھی ایسے مواقع بھی پیدا ہوتے ہیں کہ جہاں بشر کے اجتماعی شعور وعقل کا تکامل

دینی تعلیمات کی پُشت پناہی سے بے نیاز ہوتا ہے لیکن بنیادی کردار وہی ہیں جو ماضی میں تھے اور آئندہ بھی اپنی قوّت سے باقی رہیں گے۔ یہاں ہم پیغمبروں کی تعلیمات کے تاریخی تکامل میں مؤثر ہونے کے چند نمونے پیش کرتے ہیں۔

(۱) **تعلیم اور تربیّت!** زمانہ ماضی میں تعلیم و تربیّت کا باعث دینی و مذہبی بیداری رہی ہے مذہبی رجحان نے معلّم اور ماں باپ کی امنگوں کا ساتھ دیا ہے یہ موقع ان مواقع میں سے ہے جہاں اجتماعی شعور کے تکامل نے مذہبی بیداری کی ضرورت کو برطرف اور دور کر دیا ہے۔

انسان کی سماجی زندگی معاہدوں، اقرار ناموں اور قرار دادوں کے لائقِ احترام شمار کیے جانے اور عہدوں اور وعدوں کے پورا کرنے کی بنیاد پر قائم ہے۔ عہد و پیمان کا احترام بشری تمدّن کے انسانی پہلو کے ارکان میں سے ایک ہے اور یہ کام ہمیشہ مذہب کے ذمّہ تھا اور ابھی تک اس کی ذمّہ داری کو سنبھالنے کے لیے کوئی دوسرا جانشین پیدا نہیں ہوا ہے۔ ویلَ ڈورانٹ جو مذہب کے مخالف گروہ کا ایک فرد ہے کتاب" درسہائے تاریخ" میں اس بات کا اعتراف کرتا ہے اور کہتا ہے:

"مذہب نے ...... اپنے آداب و رسوم کی مدد سے انسانی معاہدوں اور میثاقوں کو (انسان اور خدا کے درمیان) باعظمت رابطوں کی شکل دے دی ہے اور اسی وجہ سے اس معاملہ میں استحکام و پائداری پیدا کر دی ہے"، مذہب کُلی طور پر اخلاقی اور انسانی قدروں کے لیے زرضمانت کی حیثیّت رکھتا ہے اور مذہب سے ہٹ کر اخلاقی قدروں کی حیثیّت ان نوٹوں کی ہے جس کے عوض میں حکومت کے خزانہ میں زرضمانت موجود نہ ہو جسکی بے اعتباری و بے وقعتی بہت جلد ظاہر و روشن ہو جاتی ہے۔

(۲) **اجتماعی قید و بند سے آزادی!** ہر طرح کے ظلم و ستم اور استبداد سے مقابلہ

پیغمبروں کے بنیادی کرداروں میں سے رہا ہے، قرآن پیغمبروں کے اس کردار کو بہت سراہتا ہے قرآن کریم اجتماعی عدالت قائم کرنے کو پیغمبروں کی بعثت و رسالت کے مقصد کے عنوان سے ذکر کرتا ہے اور اپنے قصّوں میں ظالموں، جابروں اور استبدادگروں سے پیغمبروں کی جنگ و مبارزہ کو مکرر بیان کیا ہے اور اپنی چند آیتوں میں اس بات کی تصریح ہے کہ جو طبقہ ہمیشہ پیغمبروں سے مصروفِ جنگ رہا ہے وہ یہی (جابروں اور استبدادگروں کا) طبقہ تھا۔

کارل مارکس اور اس کے پیرؤں اور ہمنواؤں کا یہ کہنا کہ "دین، حکومت، دولت و ثروت حاکم طبقہ کے تین مختلف چہرے ہیں جو مظلوم و مجبور طبقہ کے مخالف رہے ہیں" ایک بے دلیل مدعیٰ سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور تاریخی مسلّمہ حقائق کے خلاف ہے، "ڈاکٹر ارانی کارل مارکس کے نظریہ کی توجیہ ان الفاظ میں کرتا ہے" مذہب ہمیشہ مقتدر اور حاکم طبقہ کا آلۂ کار رہا ہے اور ضعیف و کمزور طبقہ کو مغلوب کرنے کے لیے ہمیشہ تسبیح اور صلیب ایک ہی صف میں اور جبر کی زبان سے حرکت کرتے رہے ہیں۔ (۱)

"تاریخ کی اس قسم کی توجیہات اور اس قسم کے تاریخی فلسفہ کو قبول کرنا صرف ایک ہی صورت میں ممکن ہے اور وہ صورت یہ ہے کہ آدمی حقائق سے چشم پوشی کرلے اور آنکھیں بند کر کے تاریخی واقعات کا مطالعہ کرے۔

علی علیہ السّلام مردِ میدانِ تیغ و تسبیح تھے ــــ تلوار کے بھی مرد تھے اور تسبیح کے بھی، مگر کس طبقہ کو مغلوب کرنے کے لیے؟ کمزور و محکوم طبقہ کو یا زبردست و حاکم طبقہ کو؟ علیؑ کا شعار وطریقہ کیا تھا؟ علیؑ آواز دیتے ہیں: "کونا للظالم خصما و للمظلوم عونا" (۲) "تم ہمیشہ ظالم کے دشمن اور مظلوم کے مددگار رہو" علیؑ اپنی تمام عمر تیغ و تسبیح کے دوست رہے اور زر و سیم کے دشمن، علیؑ کی تلوار ہمیشہ صاحبان اقتدار و حکومت اور مالکانِ سیم و زر کے خلاف مصروفِ پیکار رہی۔ بقول ڈاکٹر علی الوردی "علیؑ نے اپنی

(۱): رسالہ "انٹرنیشنلسٹ" منقول از کتاب "اصول علم روح" از ڈاکٹر ارانی۔

(۲): نہج البلاغہ

شخصیّت سے مارکس کے فلسفہ کو باطل کر دیا ہے" (۱)

مارکس کے نظریہ سے زیادہ بے ہودہ اور لایعنی نیتھشہ کا نظریہ ہے، اس کا نظریہ مارکس کے نظریہ کے بالکل برعکس ہے یعنی یہ کہ "چونکہ معاشرہ کا آگے بڑھنے والا اور تکامل پذیر طبقہ صرف طاقتوروں کا ہے اور دین کمزوروں کی حمایت کے لیے اٹھا اس لیے ایک طبقہ (طاقتوروں کا) جو ترقی کر رہا تھا اس کی ترقی بھی رک گئی لہٰذا دین ضد ترقی و تکامل اور معاشرہ کے انحطاط و تنزّلی کا سبب بنا" گویا جامعۂ بشری اسوقت تکامل کے سفر میں بڑی تیزی سے آگے بڑھے گا جب انسانی معاشرہ پر لا قانونیت اور جنگل کا قانون حکمران ہو۔ مارکس کی نظر میں تکامل کا سبب محروموں کا طبقہ ہے اور پیغمبرانِ خدا اس طبقہ کے مخالف تھے — مارکس کہتا ہے کہ دین طاقتوروں اور دولت مندوں کی اختراع ہے اور نیتھشہ کہتا ہے کہ دین کمزوروں اور محروموں کی اختراع ہے۔ کارل مارکس کا ایک اشتباہ یہ ہے کہ اس نے صرف طبقاتی منفعتوں کے تضاد کی بنیاد پر تاریخ کی توجیہ کی ہے اور تاریخ کے انسانی پہلو کو نظرانداز کیا ہے۔ (۲)

دوسری غلطی یہ ہے کہ اس نے تکامل کا عامل و سبب صرف اور صرف محروم طبقہ کو سمجھا ہے، تیسری غلطی یہ ہے کہ پیغمبروں کو حاکم طبقہ کا بازو و طرفدار قرار دیا ہے اور نیتھشہ کی غلطی یہ ہے کہ اس نے طاقت ور طبقہ کو تاریخ کے تکامل کا عامل مانا ہے اس معنی سے کہ اس نے دانا ترانسان کو سب سے طاقتور انسان کے برابر سمجھا ہے اور سب سے طاقتور انسان ہی کو جامعہ بشری کا آگے بڑھانے والا عامل مانا ہے۔ (۳)

(۱): کتاب "مھزلۃ العقل البشری"

(۲): ملاحظہ فرمائیں رسالہ "قیام و انقلاب مہدیؑ از دیدگاہ فلسفۂ تاریخ" (مؤلفہ استاد شہید مطہری (قدس))

(۳): ہم یہاں مجبور ہیں کہ "تاریخ کے تکامل میں پیغمبروں کا کردار اور فلسفۂ تاریخ" کی بحث میں اسی مختصر بیان پر اکتفا کریں اور اس کی تفصیل اور مکمل تحقیق اس کتاب میں کریں گے (انشاءاللہ) جو "فلسفۂ تاریخ علوم انسانی کی نظر سے" کے عنوان کے تحت آپ کے سامنے آئے گی جسکی یادداشتیں تیار ہو چکی ہیں۔ (مؤلف)

(۳) نبوّتوں اور بعثتوں کا مقصد ! تاریخ کے تکامل میں پیغمبروں کا کردار کسی حد تک روشن ہوگیا۔ اب ایک دوسرا مسئلہ زیر بحث ہے اور وہ یہ ہے کہ پیغمبروں کے مبعوث ہونے کا اصل مقصد اور بہ اصطلاح رسولوں کے بھیجنے اور کتابوں کے نازل کرنے کی انتہائی غرض و غایت کیا تھی؟ اور پیغمبروں کا حرف آخر و مقصد کیا ہے؟ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ بعثت کا اصلی مقصد لوگوں کی ہدایت، لوگوں کی خوش نصیبی و سعادت، لوگوں کی نجات اور لوگوں کی بھلائی اور صلاح و فلاح ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پیغمبرانِ خدا لوگوں کو سیدھی راہ دکھلانے اور لوگوں کے لیے خوش بختی اور نجات کا سامان مہیا کرنے اور لوگوں کی بھلائی، درستی اور نجات و رستگاری کے لیے مبعوث ہوئے ہیں ہماری گفتگو اس مسئلہ پر نہیں ہے، بلکہ گفتگو اس امر پر ہے کہ یہ سیدھا راستہ کس انتہائی مقصد و منزل پر ختم ہوتا ہے اور اس مکتب کی نظر میں خلق خدا کی سعادت و نیک بختی کیا ہے؟ اس مکتب میں کس قسم کی قید و بند انسانوں کے لیے تشخیص دی گئی ہے جن سے یہ لوگوں کو نجات دلانا چاہتا ہے؟ اور یہ مکتب انسانوں کی انتہائی بھلائی اور صلاح و فلاح کس چیز میں سمجھتا ہے؟

قرآن میں علاوہ اس کے کہ ان تمام مطالب و معانی کی طرف اشارہ یا ان کی تصریح کی گئی ہے دو مطلب اور دو مفہوم معین طور پر ذکر کیے گئے ہیں جن سے اصلی مقصد تک رسائی ہوتی ہے یعنی پیغمبروں کے سارے تعلیمات صرف ان دو باتوں کی تمہید ہیں؟ ہاں! صرف دو باتیں اور وہ دو باتیں یہ ہیں: (۱) خدا کو پہچاننا اور اس سے قربت و نزدیکی حاصل کرنا، (۲) جامعۂ بشری میں عدل و انصاف قائم کرنا اور قائم رکھنا۔

قرآن مجید ایک طرف آواز دیتا ہے " یا ایھا النبی انا ارسلناک شاھداً و مبشراً و نذیراً و داعیا الی اللہ باذنہ و سراجا منیرا۔ (۱)" اے پیغمبر ہم نے تم کو گواہ (امّت کا گواہ) اور

(۱) سورۂ احزاب، آیت ۴۶

خوشخبری دینے والا اور (خطرات بعد الموت سے) ڈرانے والا اور اللہ کی طرف اسی کی اجازت سے بلانے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا"۔

اس آیت میں نبیؐ کو جن القاب سے یاد کیا گیا ہے ان سے ظاہر و واضح ہوتا ہے کہ "اللہ کی طرف بلانا" تنہا وہ امر ہے جو مقصد اصلی شمار کیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف تمام پیغمبروں کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے: "ولقد ارسلنا رسلنا بالبيّنات وانزلنا معهم الكتاب والميزان ليقوم الناس بالقسط" (۱) "ہم نے اپنے رسولوں کو روشن دلیلوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور معیار و میزان نازل کیا تاکہ لوگ عدل و انصاف قائم رکھیں"۔ یہ آیت صریحاً اور صاف صاف عدل قائم کرنے کو پیغمبروں کی رسالت و بعثت کا مقصد بتا رہی ہے۔

اللہ کی طرف بلانا اور اس کو پہچاننا اور اس سے نزدیکی حاصل کرنا، یعنی توحید نظری اور توحید عملی فردی کی طرف دعوت دینا، لیکن معاشرہ میں عدل و انصاف قائم کرنا، یعنی توحید عملی اجتماعی کو برقرار کرنا، اب ہم سوال کو اس طرح پیش کرتے ہیں: کیا پیغمبروں کا اصل مقصد خدا کو پہچاننا اور اس کی پرستش کرنا ہے؟ اور دوسری تمام باتیں منجملہ عدل و انصاف اجتماعی سب خداشناسی کی تمہید ہیں؟ یا اصل مقصد عدل و انصاف کو قائم کرنا ہے اور خدا کو پہچاننا اور اس کی عبادت کرنا اس اجتماعی مقصد کے متحقق ہونے کا ایک مقدمہ اور وسیلہ ہے؟ اور اگر ہم اس سوال کو ان الفاظ میں پیش کرنا چاہیں جن الفاظ میں پہلے گفتگو کر چکے ہیں تو اسے اس طرح پیش کرنا چاہیے: آیا اصل مقصد توحید نظری و توحید عملی فردی ہے؟ یا اصل مقصد توحید عملی اجتماعی ہے؟ یہاں کئی طرح کے نظریے قائم ہو سکتے ہیں:

۱۔ پیغمبران خدا دونوں مقصد (ثنوی) رکھتے تھے۔ ان دو مقاصد میں سے ایک بشر کی اُخروی زندگی سے تعلق رکھتا ہے (یعنی توحید نظری اور توحید عملی فردی)، اور دوسرا مقصد انسان کی دنیاوی سعادت سے متعلق ہے (یعنی توحید اجتماعی)۔ انبیاء کرام اس لحاظ سے کہ انسان کی دنیوی سعادت کی فکر میں رہے ہیں، توحید اجتماعی کو قائم و برقرار کیا اور اس لحاظ سے کہ انسان کی اُخروی سعادت منظور تھی۔ توحید

(۱): سورہ حدید، ۲۵

نظری و توحید عملی فردی، جو محض ذہنی و روحانی ہے۔ کے قائم کرنے میں مشغول رہے۔

(۲) اصل مقصد توحید اجتماعی ہے اور توحید نظری و توحید عملی فردی توحید اجتماعی کا ضروری و لازمی مقدمہ ہے۔ توحید نظری خدا شناسی سے متعلق ہے۔ انسان کے لیے بحیثیت ذات انسان، کوئی ضرورت نہیں ہے کہ خدا کو پہچانے یا نہ پہچانے، اس کی روح کو حرکت دینے والا تنہا عامل و سبب خدا ہو یا ایسی ہی دوسری ہزاروں چیزیں، جسطرح سے نظریہ اول کے مطابق خداوند عالم کے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ انسان اس کو پہچانے یا نہ پہچانے، اس کی عبادت کرے یا نہ کرے، لیکن اس لحاظ سے کہ انسان کا کمال "ہم" ہونے اور توحید اجتماعی میں ہے اور یہ امر بغیر توحید نظری و توحید عملی فردی کے ممکن نہیں ہے۔ اس لیے خدا نے اپنے بندوں پر اپنی معرفت اور اپنی عبادت فرض کی ہے تاکہ توحید اجتماعی کا وجود متحقق ہو جائے۔

(۳) اصل مقصد خدا کو پہچاننا اور اس سے قربت حاصل کرنا اور اس تک پہنچنا ہے اور توحید اجتماعی اس بلند مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ اور مقدمہ ہے، کیونکہ جیسا کہ پہلے کہا گیا، توحیدی کائناتی مطالعہ میں "جہان" "اسی سے" اور "اسی کی طرف" کی ماہیت و حقیقت رکھتا ہے (۱) اس لحاظ سے انسان کا کمال اس کی طرف جانے اور اس سے نزدیکی حاصل کرنے ہی میں ہے، انسان ایک امتیاز خاص سے مشرّف ہے اور وہ یہ ہے کہ بمفاد آیۂ شریفہ "واذا نفختُ فیہ من روحی" (۲) "جب میں اس کے اندر اپنی (متعالی و برتر) روح پھونک دوں" انسان کی حقیقت و واقعیت خدائی واقعیت نظر آتی ہے، انسانی فطرت خداجوئی کی فطرت ہے۔ اس لحاظ سے اسکی نیک بختی، اس کا کمال، اسکی نجات، اس کی بھلائی، درستی اور رستگاری خدا کی معرفت اور اس کی پرستش اور اس کے قرب کی منزلیں طے کرنے میں مضمر و پوشیدہ ہے۔ لیکن اس لحاظ سے کہ انسان طبعاً مدنی و اجتماعی ہے یعنی اگر انسان کو معاشرہ سے جدا کرلیں تو وہ انسان نہیں رہ جائے گا اور اگر معاشرہ پر عادلانہ اجتماعی نظام قائم اور حکمران نہ ہو تو انسان کی خداجوئی کی (خالق کی تلاش) حرکت وجود میں نہیں آسکتی۔ تمام پیغمبر عدل و انصاف قائم کرنے

(۱) انّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون۔ (۲) سورہ حجر، ۲۹

اور ظلم واستحصال کو دور اور ختم کرنے میں مصروف رہے ہیں۔ اس بنا پر اجتماعی اقدار جیسے عدل، آزادی، برابری، اور جمہوریت اور اسی طرح اجتماعی اخلاق از قبیل جود وسخاوت، عفو ودرگذر، محبت واحسان، یہ سب کوئی ذاتی قدر وقیمت نہیں رکھتے اور محض ذاتی طور پر انسان کے لیے ان میں کوئی کمال کا پہلو نہیں ہے، ان سب کی تمام قدر وقیمت تمہیدی اور مقدّماتی ہے کہ ذوالمقدمہ (یعنی اصل مقصد) سے قطع نظر کرتے ہوئے ان کا ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہے، یہ سب کمال حاصل کرنے کے شرائط و ذرائع ہیں نہ کہ خود کمال ہیں۔ یہ فلاح ونجات کے تمہیدی عناصر ہیں نہ کہ خود فلاح ونجات۔ رُستگاری کے وسائل ہیں نہ کہ خود رستگاری۔

(۴) چوتھا نظریہ یہ ہے کہ جیسا کہ تیسرے نظریہ میں بیان ہوا۔ انسان کی غرض وغایت اور اس کا کمال بلکہ ہر موجود کی واقعی غرض وغایت اور اس کا کمال بطور خلاصہ "خدا کی طرف سفر" میں ہے اور بس۔ اس بات کا دعوےٰ کرنا کہ " انبیاء ورُسُل اپنے مقصد بعثت کے اعتبار سے (معاذ اللہ) ثنوی تھے" شرک ہے جو نا قابلِ معافی ہے، جس طرح سے یہ دعوےٰ کرنا کہ" پیغمبروں کا اصل مقصد بندگانِ خدا کی دنیوی فلاح وسعادت ہے اور دنیوی فلاح عدل، آزادی، برابری وبرادری کے سائے میں طبیعت کے عطیّات وانعامات سے مستفید ہوئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی"، محض مادّہ پرستی ہے۔ لیکن تیسرے نظریہ کے برخلاف اجتماعی واخلاقی اقدار باوجود اس کے کہ انسان کے اصیل اور اکیلے مقصد یعنی خدا شناسی وخدا پرستی تک پہنچنے کا مقدّمہ وذریعہ ہیں ذاتی طور پر بالکل بے قدر وقیمت نہیں ہیں۔

اس امر کی توضیح کہ مقدمہ اور ذوالمقدمہ (اصل مقصد) کے درمیان رابطہ وتعلق دو قسم کا ہوتا ہے ایک قسم میں مقدمہ کی قدر وقیمت صرف اتنی ہے کہ وہ ذوالمقدمہ تک پہنچا دے اور ذوالمقدمہ تک پہنچ جانے کے بعد اس مقدمہ کا ہونا اور نہ ہونا دونوں یکساں ہے مثلاً ایک انسان پانی سے بھری ہوئی ایک نہر سے عبور کرنا چاہتا ہے (اور تیرنا نہیں جانتا) وہ ایک بڑا سا پتھر نہر کے بیچ میں

پھینکتا ہے تاکہ کنارے سے کود کر پتھر پر جائے اور پتھر سے کود کر اس کنارے پر پہنچ جائے، کھلی ہوئی بات ہے کہ اس ترکیب سے جب وہ اس کنارے پر پہنچ گیا تو اب اس پتھر کا وجود و عدم اس کے لیے برابر ہے اس لیے کہ ذوالمقدمہ یعنی اصل مقصد دوسرے کنارہ پر پہنچنا تھا اور جب وہ مقصد حاصل ہو گیا تو اس پتھر کا جو بطور مقدمہ و وسیلہ تھا وجود و عدم برابر ہے۔ اسی طرح مثلاً سیڑھی مکان کی چھت پر جانے کے لیے اور طالب علم کے اُس درجہ کے کاغذات (مارک شیٹ وغیرہ) جسے وہ پاس کر چکا ہے اُس سے اوپر والے درجہ میں داخلہ کے لیے ہے۔ جب انسان چھت پر چڑھ گیا تو اس کے لیے سیڑھی کا ہونا اور نہ ہونا برابر ہے اور طالب علم کا داخلہ اوپر والے درجہ میں ہو گیا، نام لکھ لیا گیا تو اب پچھلے درجہ کے کاغذات کا ہونا اور نہ ہونا اس کے لیے برابر ہے ـــــ دوسری قسم اس رابطہ کی یہ ہے کہ مقدمہ باوجود اس کے کہ ذوالمقدمہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہوتا ہے اور باوجود اس کے کہ اصل قدر و قیمت ذوالمقدمہ تک پہنچنے کی ہے (پھر بھی) ذوالمقدمہ تک پہنچنے کے بعد مقدمہ کا وجود و عدم برابر نہیں ہے اور ذوالمقدمہ کے حاصل ہونے کے بعد بھی مقدمہ کا وجود اسی طرح ضروری ہے جس طرح حصولِ مقصد سے پہلے تھا۔ مثلاً پہلے اور دوسرے درجہ کی معلومات کا ہونا ان سے اوپر والے درجات میں داخلہ کے لیے لازمی ہے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ اوپری درجہ میں داخلہ ہو جانے کے بعد اس کے لیے ان ابتدائی درجات کی معلومات کا ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہوں اور اب ان کی کوئی ضرورت ہی نہ ہو۔ کیونکہ اگر بالفرض ابتدائی درجات میں جو معلومات حاصل کی تھیں وہ سب کی سب سہو و نسیان کی نذر ہو گئیں اور لوحِ ذہن بالکل سادہ رہ گئی ہو تو کیا ایسے طالب علم کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا؟ اور وہ صرف کاغذات کے ذریعہ اوپری درجہ میں داخلہ حاصل کر کے اپنی تعلیم جاری رکھ سکتا ہے؟

نہیں! بلکہ اس کے لیے اس مقدمہ (سابقہ معلومات) کا ہونا قطعی ضروری ہے بلکہ وہ صرف انھیں معلومات کے یاد رکھنے ہی کی صورت میں اوپری کلاس میں تعلیم جاری رکھ سکتا ہے اور اس

سے مستفید ہو سکتا ہے ورنہ نہیں۔

خلاصہ یہ کہ مقدمہ کبھی ذوالمقدمہ کا کمزور اور ہلکا درجہ ہوتا ہے اور کبھی نہیں۔ سیڑھی مکان کی چھت کے درجہ اور رتبہ کی نہیں ہے، اسی طرح نہر کے بیچ میں پھینکا ہوا پتھر نہر کے اُس پار کی زمین کے درجہ و رتبہ کا نہیں ہے لہٰذا حصولِ مقصد کے بعد ان کا وجود و عدم برابر ہو سکتا ہے لیکن پہلے والے کلاس کی معلومات کا وجود بالائی درجہ کے لیے ضروری ہے کیونکہ نچلے درجات کی معلومات اور بالائی درجہ کی معلومات درجہ و رتبہ میں برابر اور ایک حقیقت ہیں۔

اجتماعی و اخلاقی اقدار خدا کی معرفت اور پرستش کی بہ نسبت دوسری قسم میں داخل ہیں۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ اگر انسان کو خدا کی کامل معرفت حاصل ہو جائے اور وہ اس کی عبادت کرنے لگے تو اس کے نزدیک عدل و انصاف، سچائی و بھلائی، جود و کرم، احسان و خیر خواہی، عفو و مروّت و محبّت وغیرہ سب کا وجود و عدم برابر ہو اس لیے کہ انسان کا اخلاق حسنہ پر فائز ہونا ایک طرح سے خدا کا مثل ہونا ہے جیسا کہ روایت میں ہے "تَخَلَّقوا باخلاق الله" "اپنے کو الٰہی اخلاق و اوصاف سے آراستہ کرو" اخلاق عالیہ سے آراستہ ہونا درحقیقت خداشناسی و خدا پرستی کا ایک درجہ و مرتبہ ہے اگرچہ غیر شعوری طور ہی سہی۔ یعنی انسان کا ان اقدار سے تعلق الٰہی اوصاف سے مُتّصف ہونے کے ساتھ فطری لگاؤ سے پیدا ہوتا ہے اگرچہ خود انسان ان اوصاف کے فطری رشتہ و تعلق کی طرف بالکل متوجہ نہ ہو بلکہ کبھی وہ اپنے آگاہ شعور میں اس کا منکر بھی ہو۔

اسی بنا پر اسلامی معارف یہ کہتے ہیں کہ "اخلاق فاضلہ جیسے عدالت، احسان، جود و سخا، وغیرہ رکھنے والے اگرچہ مشرک ہوں مگر ان کے اعمال دوسری دنیا میں بالکل بے اثر نہیں ہوتے اس قسم کے اشخاص کا کفر و شرک اگر عناد و سرکشی کی بنا پر نہ ہو تو ان لوگوں کو دوسری دنیا میں کچھ نہ کچھ اجر ملے گا۔ درحقیقت اس قسم کے اشخاص بغیر اس کے کہ خود آگاہ ہوں خدا پرستی کے کسی درجہ تک پہنچے ہوئے ہیں" (۱)

(۱) : کتاب "عدلِ الٰہی" از مؤلف (ق س)

(۴) ایک دین یا کئی ادیان ؟ ! دین شناسی کے علماء و مصنفین اور مذاہب کی تاریخ لکھنے والے عموماً اور عادۃً "ادیان" کے عنوان کے تحت بحث کرتے ہیں مثلاً کہتے ہیں، دینِ ابراہیمؑ، دینِ یہود، دینِ مسیحی اور دینِ اسلام (گویا) ہر ایک صاحبِ شریعت پیغمبر کو علیحدہ علیحدہ ایک ایک دین کا لانے والا سمجھتے ہیں اور عام طور پر لوگوں میں مشہور اصطلاح بھی یہی ہے۔

لیکن قرآن مجید اس بارے میں ایک خاص اصطلاح اور مخصوص طرزِ بیان رکھتا ہے جس کا سرچشمہ خاص قرآنی نظریہ ہے، قرآن مجید کی نظر سے خدا کا دین حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت خاتم الانبیاء والمرسلینؐ تک صرف ایک ہے، تمام پیغمبر خواہ صاحبان شریعت ہوں یا ان کے علاوہ سبھی ایک مکتب کے داعی تھے اور ایک دین کے مبلّغ تھے، مکتبِ انبیاء کے اصول جن کا نام دین ہے ایک تھے، آسمانی شریعتوں کے فروعی مسائل میں کچھ فرق ہے مگر وہ بھی اقتضاء زمانہ، ماحول کی خصوصیات، لوگوں کی ذہنی خصوصیات کے لحاظ سے نظر آتا ہے لیکن ان تمام متفاوت و مختلف شکلوں کے باوجود سب کی حقیقت ایک تھی اور سب کی دعوت ایک ہدف اور ایک مقصد کی طرف تھی۔

دوسرا تفاوت تعلیمات کی علمی سطح پر نظر آتا ہے کیونکہ جیسے جیسے انبیاء آتے رہے اور شریعتیں لاتے رہے اور اپنے مقدس تعلیمات سے بندگان خدا کو فائدہ پہنچاتے رہے ویسے ویسے بشری معاشرہ علوم و معارف میں ترقی و تکامل کی منزلیں طے کرتا رہا اور تدریجاً آگے بڑھتا رہا، اسی بنا پر ہر بعد میں آنے والے صاحبِ شریعت پیغمبر نے اپنے تعلیمات کا نصاب اس سطح سے بلند رکھا جہاں تک اس سے قبل والے پیغمبر نے پہنچایا تھا مگر حقیقت میں سب کا موضوع ایک تھا مثلاً مبدء و معاد اور دنیا کے بارے میں اسلامی تعلیمات و معارف اور گذشتہ پیغمبروں کے تعلیمات و معارف

کے درمیان علمی سطح کے اعتبار سے زمین سے آسمان تک کا فرق نظر آئے گا، اس کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسان انبیاء کی تعلیمات سے فائدہ حاصل کرنے میں ایک طالب علم کی حیثیت سے تھا جس کو ان الہی اساتذہ نے یکے بعد دیگرے آہستہ آہستہ پہلے درجہ سے ترقی دیتے ہوئے آخریں بالائی درجے تک پہنچایا ہے، یہ دین کا تدریجی، تکامل ہے نہ کہ ادیان کا اختلاف، قرآن مجید نے کہیں بھی لفظ دین کو جمع کی صورت میں (اَدیَان) نہیں کہا ہے، قرآن کی نظر میں جس چیز کا وجود تھا وہ دین تھا نہ کہ ادیان۔

ایک واضح فرق پیغمبروں اور بڑے بڑے فلسفیوں اور ماہروں کے درمیان یہ بھی ہے کہ فلاسفہ میں سے ہر ایک کا ایک مخصوص نظریہ اور مکتب خیال تھا اور اسی وجہ سے دنیا میں ہمیشہ "بہت سے فلسفے" موجود رہے نہ کہ ایک "فلسفہ"، لیکن پیغمبرانِ خدا ہمیشہ ایک دوسرے کے مؤید اور تصدیق کرنے والے رہے ہیں اور کبھی بھی ایک دوسرے کی نفی نہیں کی، پیغمبروں میں سے اگر کوئی پیغمبر کسی دوسرے پیغمبر کے زمانہ اور ماحول میں ہوتا تو اسی کے قوانین اور احکام کے مانند قوانین لاتا۔

قرآن اس بات کو صراحت سے بیان کرتا ہے کہ تمام پیغمبروں کا (از آدمؑ تا خاتمؐ) ایک سلسلہ تھا اور سب ایک آسمانی رشتہ میں منسلک تھے، گذشتہ انبیاء اپنے بعد آنے والے پیغمبروں کی بشارت دیتے رہے اور بعد میں آنے والے انبیاء گذشتہ انبیاء کی تصدیق و تائید کرتے رہے، نیز قرآن مجید اس کی بھی تصریح کرتا ہے کہ تمام پیغمبروں سے اس امر کا کہ وہ سب ایک دوسرے کے مبشّر و مصدق ہوں تاکیدی عہد و پیمان لیا گیا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے "(اے میرے حبیب!) اس وقت کو یاد کرو جب خداوندِ عالم نے تمام پیغمبروں سے عہد و پیمان لیا کہ جب میں تم کو کتاب اور حکمت دوں گا پھر تمہارے پاس ایک پیغمبر تمہاری رسالت کی تصدیق کرتے ہوئے آئے گا تو تم سب اس کے اوپر ضرور ایمان لانا اور اس کی ضرور مدد کرنا (پھر خدا نے) فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کیا اور کیا تم نے میرا عہد و پیمان اپنے ذمہ لے لیا؟ (تو ان سب نے) کہا کہ ہم نے اقرار کیا (پھر خدا نے) فرمایا کہ تم گواہ رہنا

اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔" (۱)

قرآن کریم جو دینِ خدا کو آدمؑ سے خاتمؐ تک ایک ہی جاری رہنے والے سلسلہ کی حیثیت سے پہچنواتا ہے نہ کہ چند کڑیوں کے عنوان سے اس سلسلے کا صرف ایک نام رکھتا ہے اور وہ ہے "اسلام"۔ ہمارے کہنے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ دینِ خدا ہر دور اور ہر زمانہ میں اپنے اسی نام سے پکارا جاتا رہا ہے، یا یہی نام لوگوں کے درمیان مشہور و معروف رہا ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ دین کی حقیقت ایک ایسی ماہیت رکھتی ہے جس کا بہترین معرّف اور عنوان لفظ اسلام ہے۔ قرآن کہتا ہے: "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ" (۲) "دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے"، یا دوسری جگہ کہتا ہے "ما کان ابراهیم یهودیاً ولا نصرانیاً ولکن کان حنیفاً مسلماً" (۳) "ابراہیمؑ نہ تو یہودی تھے اور نہ عیسائی تھے بلکہ حق کی تلاش کرنے والے اور مسلم تھے"۔

ختمِ نبوّت: ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ پیغمبرانِ خدا باوجود جزوی اختلافِ مسائل کے سب صرف ایک پیغام کے حامل و مبلغ اور ایک مکتب سے وابستہ تھے، یہ مکتب بشری معاشرہ کی فکری صلاحیت و استعداد کے مطابق درجہ بدرجہ پیش کیا گیا ہے یہاں تک کہ انسانی معاشرہ فکری رشد کے لحاظ سے اس حد تک پہنچ گیا کہ یہ مکتب اور یہ نظریہ مکمل و جامع شکل میں پیش کیا گیا اور جب مکتب اس نقطۂ عروج و کمال پر پہنچ گیا تو نبوّت کا سلسلہ بھی ختم کر دیا گیا اور وہ عظیم و مقدس شخصیت جن کے ذریعہ سے یہ مکتب کامل شکل میں پیش کیا گیا وہ ذاتِ بابرکاتِ حضرتِ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ہے اور اس مکتب کا

(۱): واذ اخذ اللہ میثاق النبیین لما اتیتکم من کتاب وحکمۃ ثم جاءکم رسول مصدقا لما معکم لتؤمننّ بہ ولتنصرنّہ۔ قال ءاقررتم واخذتم علی ذالکم اصری۔ قالوا اقررنا قال فاشھدوا وانا معکم من الشاھدین (سورۂ آل عمران - ۸۱)

(۲): آل عمران — ۱۹ (۳) آل عمران — ۶۷۔

آخری مکمل نصاب اور آخری آسمانی کتاب قرآن مجید ہے اور جیسا کہ قرآن مجید میں ارشادِ خداوندی ہے
" وتمت کلمۃ ربك صدقا وعدلا۔ لا مبدل لکلماتہ " (۱) " تمہارے پروردگار کا سچا اور عادلانہ
پیغام پورا ہوگیا، اس میں کوئی تغیر و تبدل کرنے کی کسی کو طاقت نہیں ہے۔"

اب ہمیں غور کرنا ہوگا کہ ماضی میں کیوں نبوتوں کی تجدید ہوتی رہی اور ایک کے بعد دوسرے پیغمبر برابر آتے رہے؟ اگرچہ وہ تمام پیغمبر صاحبانِ قانون و شریعت نہیں تھے، بلکہ ان میں سے اکثر انبیاء اپنے زمانوں میں موجودہ شریعت و قانون ہی کے مبلغ رہے ہیں اور حضرت ختمی مرتبتؐ کے بعد کیوں یہ سلسلۂ انبیاء ختم کر دیا گیا؟ اور نہ صرف یہ کہ کوئی تشریعی (صاحبِ شریعت) پیغمبر نہیں آئے اور نہ آئیں گے بلکہ کوئی تبلیغی پیغمبر بھی نہیں آئے اور نہ قیامت تک آئیں گے، کیوں؟ اس مقام پر ہم مختصر طور پر نبوتوں کی تجدید کے اسباب و علل پر نگاہ ڈالتے ہیں:۔

نبوّتوں کی تجدید کے اسباب!

باوجودیکہ نبوّت ایک متصل جاری رہنے والا سلسلہ اور خدا کا پیغام ہے یعنی دین صرف ایک حقیقت ہے، ایک سے زیادہ نہیں ہے تشریعی و تبلیغی نبوّتوں کی تجدید اور متواتر ایک کے بعد دوسرے پیغمبر کے آنے اور حضرت خاتم الانبیاءؐ کی تشریف آوری کے بعد اس سلسلہ کے منقطع ہو جانے کے اسباب و علل حسب ذیل ہیں:

۱۔ زمانۂ قدیم کا انسان قابلیت اور فکری اعتبار سے اس قابل نہ تھا کہ اپنی آسمانی کتاب کی حفاظت کر سکے اسی وجہ سے آسمانی کتابیں عموماً تحریف و تبدیلی کا شکار ہو جایا کرتی یا بالکل ہی فنا ہو جائیں۔ اس بنا پر ضروری ہو جاتا تھا کہ اس پیغام کی تجدید ہو ۔ قرآن کریم کے نازل ہونے کا زمانہ یعنی آج سے چودہ صدی قبل کا دور وہ دور تھا جب کہ جامعہ بشریت اپنے زمانۂ طفولیت کو بہت پیچھے چھوڑ کر حد بلوغ کو پہنچ چکا تھا اور اس وقت انسان اپنی علمی اور دینی میراث کی حفاظت کرنے

(۱): سورۂ انعام ۔ ۱۱۵

پر قدرت حاصل کر چکا تھا، اسی وجہ سے سب سے آخری مقدّس و مکمل آسمانی کتاب یعنی قرآن کریم میں کوئی تحریف نہیں ہو سکی۔ مسلمان اس کی ہر آیت کی حفاظت اس کے نازل ہونے کے وقت ہی سے اپنے ذہنوں اور تحریروں کے ذریعہ کرتے رہے اور اس طرح سے اس کی حفاظت کرتے رہے کہ اس میں کسی قسم کے تغیر، تبدیلی، تحریف، حذف اور اضافہ کا امکان ہی باقی نہ رہ جائے یہی وجہ ہے کہ اس مقدّس اور آخری آسمانی کتاب میں کسی قسم کی کوئی تحریف نہیں ہو سکی اور اس طرح یہ سبب جو نبوتوں کی تجدید کے اسباب میں سے ایک تھا بالکل ختم ہو گیا۔

۲۔ گذشتہ دوروں میں بشریّت صلاحیت اور فکری قابلیت کے لحاظ سے اس پر قادر نہیں تھی کہ اپنی زندگی کے لیے مکمل طور پر کوئی آئین اور لائحہ عمل مرتّب کر سکے جس کی رہنمائی میں وہ اپنے سفر کو جاری رکھ سکے، اس لیے ضروری تھا کہ مرحلہ بہ مرحلہ اور منزل بہ منزل اس کی رہنمائی کی جاتی رہے اور ایک یا کئی رہبر و رہنما ہمیشہ اس کے ساتھ رہیں۔

لیکن حضرت خاتم الانبیاءؐ کے مبارک دور میں اور اس کے بعد وہ قوّت و توانائی جو کلّی و مکمل نقشہ اور لائحہ عمل مرتّب کر سکے انسان کو حاصل ہو چکی تھی لہٰذا مرحلہ بہ مرحلہ اور منزل بہ منزل والا نقشہ مرتّب کرنے کی ضرورت ختم ہو گئی اور اس کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ شریعتوں کی تجدید کا سبب مذکورہ بالا وجہوں کے علاوہ یہ بھی تھا کہ انسان قدرت نہیں رکھتا تھا کہ اپنے واسطے کوئی مکمل اور جامع پروگرام بنا سکے اور جب یہ قدرت و استعداد اس میں پیدا ہو گئی تو مکمل اور جامع پروگرام تیار کرنے کا کام خود اس کے اختیار میں دے دیا گیا اور نبوّتوں اور شریعتوں کی تجدید کا یہ دوسرا سبب بھی ختم ہو گیا۔ امّت کے علماء، وہ متخصّص اور اسپیشلسٹ ہیں جو اسلام کے مرتّبہ و پیش کردہ مکمل و جامع لائحہ عمل و ضابطۂ حیات سے استفادہ کرتے ہوئے آئین و دستور العمل کی ترتیب و تدوین کر کے بشریّت کی راہ نمائی کر رہے ہیں۔

۳۔ پیامبروں کی کثیر تعداد بلکہ ان کی اکثریّت تبلیغی تھی نہ کہ تشریعی (صاحب شریعت) بلکہ

صاحبانِ شریعت پیغمبروں کی تعداد شاید ایک ہاتھ کی انگلیوں کی تعداد سے زیادہ نہیں ہے تبلیغی پیغمبروں کا کام اس شریعت کی ترویج و تبلیغ اور اجراء و تفسیر کرنا تھا جو ان کے زمانے کے لوگوں پر حاکم تھی اِس خاتمیت کے دورِ علم میں امتِ اسلامی کے علماء قادر ہیں کہ اسلام کے کُلیات اصول کی معرفت؛ زمانہ و مقام کے شرائط سے واقفیت و آگاہی حاصل کر کے ان کُلیات کو زمان و مکان کی ضرورت و حالات سے مطابقت دیتے ہوئے احکامِ الٰہی کا استخراج و استنباط کریں۔ اسی عمل کا نام "اجتہاد" ہے۔ امّت اسلامی کے لائق و فائق علماء تبلیغی پیغمبروں کے بہت سارے فرائض اور تشریعی پیغمبروں کے کچھ فرائض کو (بغیر اس کے کہ خود اپنی طرف سے کوئی شریعت بناتے ہوں) عملِ اجتہاد کے ذریعہ امّت کی رہنمائی کے خاص فریضہ کو انجام دیتے ہیں، اس لحاظ سے عین اس حالت میں کہ دین کی ضرورت ہمیشہ ہے بلکہ بشریّت جس قدر تمدّن اور ترقی کی طرف آگے بڑھتی جاتی ہے دین کی احتیاج اور زیادہ ہوتی جاتی ہے، نبوّت و شریعت کی تجدید اور کسی جدید آسمانی کتاب یا نئے پیغمبر کے آنے کی ضرورت بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی اور نبوّت کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ (۱)

اس بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ختمِ نبوّت میں بشر کی اجتماعی و فکری بلوغ و پختگی کا خاص اور اہم کردار رہا ہے اور اس کردار کے کئی پہلو ہیں:

(۱) فکری اور اجتماعی بلوغ نے اس کی آسمانی کتاب کو تحریف سے محفوظ رکھا ہے۔

(۲) یہ فکری رشد اس حد تک پہنچ گیا کہ اپنے تکاملی پروگرام کو "منزل بہ منزل" کے بجائے ایک ہی مرحلے میں اپنی تحویل میں لے لیا اور اس سے استفادہ کیا۔

(۳) اجتماعی فکری پختگی اور سمجھداری اس کو اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہ دین کو برقرار اور اس کی ترویج و تبلیغ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جیسے فرائض کی ذمّہ داری قبول کرے اس سے تبلیغی پیغمبروں کی (جو صاحب شریعت پیغمبروں کی شریعت کے مروّج و مبلّغ تھے) ضرورت رفع ہوگئی اور اب اس ضرورت کو امّت کے علماء و صلحاء پورا کرتے ہیں۔

(۱) ختمِ نبوّت کی مفصّل بحث کے لیے مؤلف کی کتاب "ختمِ نبوّت" کا مطالعہ فرمائیں۔

۴۔ بشریت اپنی فکری پختگی کے لحاظ سے اس منزل پر پہنچ گئی کہ وہ" اجتہاد"کی روشنی میں وحی کے کلیات کی توجیہ و تفسیر کرسکے اور مکانی اختلاف اور زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات کی صورتوں میں پیش آنے والے ہر مسئلہ کو اس سے متعلقہ اصل کی طرف موڑ سکے اس جہم کو بھی امت مسلمہ کے علماء انجام دے رہے ہیں۔

معلوم ہوا کہ ختم نبوت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ"اب انسان کو الٰہی و تبلیغاتی تعلیمات کی جو وحی کے ذریعہ سے پہنچی ہیں احتیاج ختم ہوگئی ہے اور چونکہ انسان کو اس کے فطری بلوغ کی وجہ سے ان تعلیمات کی احتیاج نہیں رہ گئی اس لیے نبوت کا سلسلہ بھی ختم کر دیا گیا" نہیں! ہرگز نہیں! بلکہ جدید وحی اور جدید نبی و رسول کی ضرورت نہیں نہ کہ الٰہی دین اور اس کے تعلیمات کی ضرورت ختم ہوئی ہے۔

مشہور و عظیم اسلامی مفکر علامہ اقبال (لاہوری) اسلامی مسائل میں اپنی تمام نکتہ سنجیوں اور دقت نظر (جن سے ہم نے اپنی اس کتاب اور دوسری کتاب میں کافی استفادہ کیا ہے) کے باوجود فلسفۂ ختم نبوت کی توجیہ و تفسیر میں سخت اشتباہ سے دوچار ہوئے ہیں۔ موصوف نے اپنی اس بحث کی بنیاد چند اصلوں پر رکھی ہے:

(۱) **وحی** : جس کے لغوی معنی "آہستہ اور رازدارانہ انداز میں بات کرنا" ہیں، یہ لفظ قرآن مجید میں ایک وسیع مفہوم پاگیا ہے جو مرموز و خفیہ ہدایتوں کی بہت سی قسموں کو شامل ہے اور جو جماد و نبات و حیوان کی ہدایت سے لے کر انسان تک کی ہدایت کے لیے استعمال ہوا ہے (اس کے بارے میں) علامہ اقبال کہتے ہیں: " اصل وجود کے ساتھ یہ اتصال کسی طرح بھی صرف انسان کے لیے مخصوص نہیں ہے، قرآن میں لفظ وحی کے استعمال کی شکل یہ بتاتی ہے کہ یہ کتاب اس (وحی) کو زندگی کی ایک خاصیت جانتی ہے، یہ اور بات ہے کہ اس کی شکل و خاصیت زندگی کے تکامل کے مرحلوں و منزلوں کے مطابق مختلف ہوتی ہے۔ وہ گھاس

جو کسی جگہ پر اُگتی اور آزادی کے ساتھ نشوونما پاتی ہے، وہ جانور جو زندگی کے نئے ماحول سے مانوس ہونے کے لیے ایک نئے عضو بدن کا مالک ہوتا ہے اور وہ انسان جو زندگی کی اندرونی گہرائیوں میں ایک نئی روشنی کو معلوم کرلیتا ہے، یہ سب کے سب وحی کے مختلف حالات کے نمائندے ہیں جو وحی کو قبول کرنے والی ظرفیت وصلاحیت کی ضرورتوں کے مطابق یا ان نوعی ضرورتوں کے مطابق جن سے وہ ظرف تعلق رکھتا ہے مختلف وگوناگوں شکلوں میں نمایاں ہوتی ہے" (۱)

(۲) وحی۔ فطری قوت قسم کی ایک چیز ہے اور وحی کی ہدایت فطری قوت کی ہدایت قسم کی ایک چیز ہے۔

(۳) وحی۔ طبیعت انسان کی ہدایت کا نام ہے، یعنی انسانی معاشرہ اس اعتبار سے کہ وہ ایک وحدت ہے اور مخصوص راستہ اور حرکت کے قوانین رکھتی ہے اس لیے اس بات کی محتاج ہے کہ اس کی ہدایت کی جائے، نبی وہ پکڑنے والی مشین ہے جو فطری طور پر ان پیغامات کو جن کی احتیاج بشر کو ہے حاصل کرلیتی ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں :-

" دنیاوی زندگی ایک الہامی صورت سے اپنی حاجتوں کو دیکھتی ہے اور بہت ہی قلیل مدت میں اپنی مسافت اور رفتار کی سمت کو معین کرلیتی ہے، یہ وہی چیز ہے جس کو ہم دین کی زبان میں " پیغمبر پر وحی ہونا" کہتے ہیں۔ (۲)

(۴) تمام جاندار اپنے وجود کی ابتدائی منزلوں میں فطری قوت کے ذریعہ ہدایت پاتے ہیں اور جیسے جیسے ترقی وتکامل کے درجوں میں بلند ہوتے جاتے ہیں اور احساس اور تخیل اور سوچنے کی قوت ان کے اندر زیادہ ہوتی جاتی ہے ویسے ہی ان کی فطری قوت گھٹتی جاتی ہے اور حقیقت میں احساس اور اندیشہ کی قوت فطری قوت کی جانشین ہوجاتی ہے، اسی وجہ سے حشرات (چھوٹے جانور جیسے کیڑے مکوڑے) سب سے زیادہ فطری شعور رکھتے ہیں اور انسان کم تر فطری شعور کے حامل ہوتے ہیں۔

(۵) انسانی معاشرہ اجتماعی لحاظ سے ایک ترقی پذیر اور تکامل کی راہ پر گامزن ہے اور جسطرح حیوانات

(۱) احیاء فکر دینی در اسلام صہ ۱۴۴، ۱۴۵ (۲) احیاء فکر دینی در اسلام صہ ۱۶۸

ابتدائی مراحل میں فطری شعور کے محتاج ہیں اور جیسے احساس وتخیل اور کبھی تفکر کی قوت ان کے اندر بڑھتی جاتی ہے ویسے ہی فکری ہدایتیں فطری شعور کی جانشین ہوتی جاتی ہیں، اسی طرح انسانی معاشرہ بھی اپنے تکامل میں اس منزل پر پہنچ گیا جہاں تعقل اور سمجھنے کی قوت اس کے اندر رُشد وپختگی پا گئی اور یہی چیز فطری شعور و قوت (وحی)، کے ضعف و کمزوری کا سبب بن گئی ہے۔ موصوف کہتے ہیں:-

"بشریت کے دورِ طفلی میں روحانی طاقت ایک چیز کو ظاہر کرتی ہے جس کو میں "پیغمبرانہ خود آگاہی" کا نام دیتا ہوں۔ تیار شدہ دستوروں، بزرگوں کے فیصلوں اور تجربہ سے حاصل شدہ انتخابوں کی پیروی سے انسان اپنی فردی فکر اور انتخاب راہ زندگی میں تضییع اوقات سے بچتا ہے۔ لیکن عقل کے کامل اور تنقیدی قوت کے پیدا ہو جانے کے بعد بشری زندگی اپنے نفع کے لیے اس قسم کی خود آگاہی کو نشو و نما دینے کے لیے پہلے مرحلہ کی روحانی طاقت (وحی)، کو متوقف کرتی ہے۔ انسان پہلے خواہشات اور فطری قوت کا محکوم و فرماں بردار ہے استدلال کرنے والے کی عقل جو بس تنہا ماحول پر اس کے مسلط ہونے کا سبب ہے خود وہ ایک ترقی اور پیشرفت ہے اور جب عقل وجود میں آگئی تو چاہیے کہ معرفت کی دوسری شکلوں (فطری شعور اور راہنمائی) سے باز رکھ کر اس کو (عقل کو)، تقویت پہنچائیں" (۱)

(۶) بشریت کی دنیا دو بنیادی دور رکھتی ہے۔ ۱۔ وحی کی راہنمائی کا دور۔ ۲۔ طبیعت اور تاریخ میں تفکر و تعقل کی راہنمائی کا دور۔ اگرچہ قدیم دنیا میں فلسفہ کے چند مکتب (جیسے یونان اور روم) موجود تھے لیکن ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی اور انسانیت ابھی طفلی دور سے گذر رہی تھی۔ علامہ اقبال کہتے ہیں:-

"اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم دنیا، جس میں انسان موجودہ حالت کے مقابلہ میں ابتدائی دور کی زندگی رکھتا تھا اور کم و بیش وہم اور تخیل کا تابع تھا، اگرچہ اس نے فلسفہ کے چند مکتب قائم کر لیے تھے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ قدیم دنیا میں فلسفی نظریات کا قائم کرنا محض فکر و اندیشہ کا کام تھا کیونکہ اس وقت تک انسان مبہم دینی معتقدات اور رائج سنتوں اور طریقوں سے آگے نہ بڑھ سکا تھا اور

(۱) احیاء فکر دینی در اسلام ص ۱۴۵۔

زندگی کے عینی اور واقعی حالات کے بارے میں کوئی لائق اعتماد نظریہ ہمارے لیے مہیا نہیں کرسکتا تھا"(۱)

(۷) پیغمبر اکرمؐ جو خاتم النبیین ہیں قدیم دنیا سے بھی تعلق رکھتے ہیں اور جدید دنیا سے بھی۔ اپنے الہام کے سرچشمہ یعنی وحی (نہ کہ طبیعت و تاریخ کا تجرباتی مطالعہ) کے لحاظ سے قدیم دنیا سے تعلق رکھتے تھے اور اپنی تعلیمات کی روح یعنی طبیعت و تاریخ کے مطالعہ اور تفکر و تعقل کی دعوت کے لحاظ سے جس کے پیدا ہونے کے ساتھ ہی وحی کا کام تمام ہوتا ہے جدید دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ علامہ موصوف کہتے ہیں

"پس جب مسئلہ وحی پر اس نقطۂ نگاہ سے غور کیا جائے تو کہنا چاہیے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ قدیم دنیا اور جدید دنیا کے درمیان میں کھڑے ہیں، جہاں تک کہ آنحضرتؐ(۲) کا رابطہ آپ کے الہامی منبع و سرچشمہ سے ہے آپ قدیم دنیا سے متعلق ہیں اور جہاں سے آپ کے الہام کی روح کارفرما ہوتی ہے آپ جدید دنیا سے متعلق ہیں۔

زندگی نے آپ کے اندر معرفت کے جدید سرچشمے آشکار کیے(۲) جو آپ کی جدید روش زندگی سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اسلام کا ظہور اور عقل کا ظہور ایک استقرائی دلیل ہے، ظہور اسلام کے ساتھ جس کے نتیجہ میں خود رسالت کے ختم ہو جانے کی ضرورت آشکار ہو جاتی ہے اور اسی کے ساتھ یہ ضرورت بھی اپنے حدِ کمال کو پہنچ جاتی ہے اور یہ چیز خود اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ زندگی ہمیشہ مرحلہ طفلی اور خارج سے رہبری کی منزل میں نہیں رہ سکتی۔ اسلام میں کہانت (غیب گوئی) اور میراثی حکومت کو غلط و باطل قرار دینا، عقل کی طرف دائمی توجہ اور قرآن سے تجربہ حاصل کرنا اور وہ اہمیت جو یہ کتاب مبین طبیعت اور تاریخ کو بشری معرفت کے سرچشمہ کے عنوان سے دیتی ہے یہ سب کی سب دورِ رسالت کے خاتمہ کی مختلف علامتیں ہیں" (۳)

یہ ہیں ختم نبوت کے فلسفہ کے ارکان و اصول، علامہ اقبال کی نظر میں۔ ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ فلسفہ مخدوش ہے اور اس کے بہت سے اصول غیر صحیح ہیں۔ پہلا اعتراض جو اس فلسفہ پر وارد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ فلسفہ اگر صحیح مان لیا جائے جس کی رو سے نہ صرف یہ کہ جدید وحی

(۱): وہی ماخذ ص ۱۲۵ (۲): (یعنی طبیعت اور تاریخ کے مطالعہ کے ذریعہ معرفت) (۳): احیاء فکر دینی در اسلام ص ۱۴۸

اور جدید نبی کی کوئی ضرورت نہیں رہی ہے بلکہ وحی کی رہنمائی کی بھی قطعاً ضرورت نہیں ہے کیونکہ تجرباتی عقل کی ہدایت وحی کی ہدایت کی جانشین ہو چکی ہے" اگر یہ فلسفہ صحیح ہو تو پھر یہ فلسفہ دین و دیانت کے خاتمہ کا فلسفہ ہے نہ کہ ختمِ نبوت کا اور اس فلسفہ کی رُو سے وحی اسلامی کا کام صرف یہ اعلان کرنا ہے کہ دین کے دَور کا خاتمہ اور عقل و علم کے دور کا آغاز ہو گیا ہے یہ مطلب و نظریہ نہ صرف اسلام کی ضرورت کے خلاف ہے بلکہ خود اقبالؒ کے نظریہ کا مخالف ہے۔ اقبال کی تمام تر کوششیں اس امر میں صرف ہوئی ہیں کہ علم و عقل، انسانی معاشرہ کے لیے لازم ہیں لیکن کافی نہیں ہیں۔ انسان دین اور مذہبی ایمان کا اتنا ہی نیازمند ہے جتنا علم کا۔

علامہ اقبالؒ خود صراحتہً کہتے ہیں کہ زندگی ثابت اصول اور بدلتے رہنے والے فروع کی محتاج ہے اور "اسلامی اجتہاد" کا کام اصول کے ساتھ فروع کا منطبق کرنا ہے، موصوف کہتے ہیں :- "اس علم جدید (اسلامی عقائد) نے[1] نے وحدت جہانی کی بنیاد توحید کی اصل پر رکھی ہے، اسلام نظامِ حکومت کے عنوان سے اس امر کے لیے ایک عملی ذریعہ ہے کہ اصل توحید کو نوع بشر کی عقلی اور باہمی زندگی میں ایک زندہ عامل وسبب قرار دے، اسلام خدا کے بارے میں وفاداری کا خواہش مند ہے نہ کہ ظالم و استبداد گر حکومت سے اور چونکہ خدا ہی ہر زندگی کی آخری روحانی بنیاد ہے لہٰذا خدا سے وفاداری عملاً، خود آدمی کی مثالی[2] طبیعت سے وفاداری ہے وہ معاشرہ جو حقیقت کے ایسے تصوّر پر قائم ہوا ہو اسے چاہیے کہ وہ اپنی زندگی میں "ابدیت" اور "تغیر" دونوں مقولوں کے درمیان آپس میں موافقت پیدا کرے اسی طرح اپنی اجتماعی زندگی کی تنظیم کے واسطے ابدی اصول اپنے لیے رکھتا ہو، کیونکہ جو چیز بھی ابدی اور دائمی ہے وہ اس (ہمیشہ) تغیر پذیر دنیا میں ہمارے واسطے محکم بنیادیں مہیا کرتی ہے، لیکن جب ابدی اصول کے معنی یہ سمجھے جائیں کہ وہ ہر تغیر و تبدیلی کے معارض و مخالف ہیں یعنی ان چیزوں کے معارض و مخالف ہیں جنھیں قرآن خدا کی بزرگترین (آیات)، نشانیوں میں سے قرار دیتا ہے تو اس وقت وہ اس کا سبب بنیں گے کہ جو چیز ذاتی طور پر حرکت میں ہے اسے حرکت سے روک دیں، علوم سیاسی و اجتماعی میں یورپ

(۱) : (یعنی اسلامی)　　(۲) : یعنی آرزو خواہی اور کمال مطلوب جوئی کی طبیعت۔

کی شکست پہلی اصل (۱) کو مجسم کردیتی ہے اور ان آخری پانچ سو (۵,۰۰) برسوں کی تمام مدّت میں اسلام کی خاموشی و بے حرکتی دوسری اصل (۲) کو مجسم کرتی ہے۔ اسلام میں حرکت کی اصل کیا ہے؟ وہی اصل جو " اجتہاد " کے نام سے پکاری جاتی ہے"! (۳)

مذکورہ بالا بیان کے مطابق وحی کی رہنمائی کی ضرورت ہمیشہ باقی ہے اور تجرباتی عقل کی رہنمائی وحی کی رہنمائی کی جانشین نہیں ہوسکتی، خود اقبال بھی ہدایت و رہنمائی کی دائمی احتیاج کی اصل بقا کے سو فیصدی طرف دار ہیں لیکن انھوں نے ختم نبوّت کے واسطے جو فلسفہ بیان کیا ہے وہ اس بات کو لازم قرار دیتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ جدید وحی اور جدید رسالت کی احتیاج بلکہ وحی کی رہنمائی کی احتیاج بھی ختم ہوجائے اور درحقیقت اس فلسفہ کی رُو سے نہ صرف نبوّت کا سلسلہ ختم ہوتا ہے بلکہ دیانت بھی ختم ہوجاتی ہے۔

ختم نبوّت کے بارے میں اقبال کی اشتباہ آمیز توجیہ اس امر کا سبب بنی کہ ان کی بحث و گفتگو سے وہی غلط نتیجہ نکالا جائے کہ ختم نبوّت کا دور یعنی انسان کا وحی سے استقلال اور آزاد ہوجانے کا دور (اور یہ سمجھا جائے کہ) انسان کے لیے پیغمبروں کی رہنمائی، تعلیم و تربیت کی احتیاج ایسی ہی ہے کہ جیسے بچہ کے لیے معلّم و استاد کی احتیاج ہوتی ہے، بچہ اپنے معلّموں اور استادوں سے علم حاصل کرتا ہوا ہر سال ایک درجہ اوپر بڑھتا جاتا ہے اور معلّم کو بدلتا جاتا ہے، انسان نے بھی دور بہ دور اور مرحلہ بہ مرحلہ ترقی کے آخری مراحل میں قدم رکھا ہے اور ہر دور میں قانون و شریعت کو بدلتا رہا ہے، بچہ (طالب علم) انتہائی اور آخری کلاس میں پہنچتا ہے اور فارغ التحصیل ہونے کی سند حاصل کرتا ہے اور اس کے بعد معلّم و استاد سے آزاد ہوکر خود مستقل طور سے تحقیق میں مشغول ہوجاتا ہے (اسی طرح) دورِ خاتمیت کا انسان بھی ختم نبوّت کے اعلام و اعلان کے ساتھ ہی تحصیلات سے فارغ ہوجانے اور کلاسیکی تعلیمات سے بے نیازی کی سند حاصل کرکے خود مستقلاً طبیعت و تاریخ کے مطالعہ کے تحقیق میں مصروف

(۱): یعنی ہر قسم کی ابدی اصل کی نفی اور زندگی کے اصلی اصول کی ابدیت سے انکار۔

(۲): اصل تغییر سے انکار اور ابدیت پر اعتقاد۔ (۳): احیاء فکر دینی در اسلام ص۱۶۸-۱۶۹

ہوجاتا ہے اور" اجتہاد"؟ یعنی پس ختم نبوت یعنی انسان کا استقلال اور بے نیازی کی منزل میں پہنچ جانا۔

بلاشک ختم نبوت کی اس طرح کی تفسیر وتوجیہ غلط ہے، ختم نبوت کی اسطرح کی تفسیر کے نتائج نہ تو اقبال کے لیے قابل قبول ہیں اور نہ ان لوگوں کے لیے جنھوں نے علامہ کی تحریر سے یہ نتیجہ نکالا ہے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر علامہ اقبال کا یہ نظریہ درست ہو تو چاہیے کہ تجربی عقل کے پیدا ہونے کے بعد جس کو اقبال "تجربہ درونی" کا نام دیتے ہیں" اولیاء اللہ کے مکاشفات" کا بھی خاتمہ ہوجائے کیونکہ فرض یہ ہے کہ یہ امور ایک قسم کی فطری شعور کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں اور ظہور عقل تجربی کے ساتھ فطری شعور کا مرحلہ ختم ہوتا ہے، حالانکہ خود اقبال تصریح کرتے ہیں کہ باطنی تجربہ ہمیشہ کے لیے باقی ہے اور اسلام کی نظر میں باطنی واندرونی تجربہ معرفت کے تینوں سرچشموں میں سے ایک ہے۔(۱)

اقبال شخصی طور پر ایک شدید عرفانی میلان رکھتے ہیں اور معنوی الہامات کے شدت سے معتقد ہیں، وہ خود کہتے ہیں؛ " یہ فکر اس معنی میں نہیں ہے کہ" باطنی تجربہ" جو کیفیت کے لحاظ سے" پیغمبرانہ تجربہ" سے مختلف نہیں ہے، اب اس کی حیاتی واقعیت کا جو سلسلہ تھا وہ منقطع ہوگیا، قرآن" انفس یعنی خود اور" آفاق" یعنی جہان (دنیا) کو علم ومعرفت کا سرچشمہ سمجھتا ہے، خداوند عالم اپنی نشانیوں کو اندرونی تجربہ میں بھی ظاہر کرتا ہے اور بیرونی تجربہ میں بھی اور آدمی کا فرض یہ ہے کہ تجربہ کی تمام علامتوں کی معرفت کو قضاوت کی پیش گاہ میں فیصلہ کے لیے رکھے، خاتمیت کے اندیشۂ فکر کو اس معنی میں نہیں لینا چاہیے کہ زندگی کا آخری ونہائی فیصلہ باطنی قوت کی جگہ پر عقل کا جانشین کامل ہوجانا ہے، ایسی چیز نہ تو ممکن ہے اور نہ وہ مطلوب ہے اس اندیشۂ وتفکر کی عاقلانہ قدروقیمت اس امر میں ہے کہ یہ باطنی تجربہ کے مقابل میں ایک مستقل پرکھنے والی طاقت پیدا کرتی ہے اور یہ امر اس اعتقاد کی پیدائش سے حاصل ہوتا ہے کہ اشخاص کے" مافوق الطبیعت" (خدا) سے اتصال کے دعوے کی حجیت اور اعتبار انسانی تاریخ میں ختم ہوچکا ہے .... اس بنا پر اب چاہیے کہ ایک تحقیقی تجربہ کے زاویہ سے باطنی تجربہ پر چاہے وہ جتنا بھی غیر عادی وغیر معروف ہو، نگاہ ڈالی جائے اور انسانی تجربہ کی

(۱) بقیہ دو سرچشمے طبیعت اور تاریخ ہیں۔

دوسری نشانیوں کے مانند اس کو تنقیدی نظر سے بحث و تحلیل کا موضوع قرار دیا جائے"۔ [۱]

اقبال کا ان کی گفتگو کے آخری حصہ میں مقصود یہ ہے کہ نبوّت کے ختم ہو جانے کے ساتھ الہامات اور اولیاء اللہ کے مکاشفات و کرامات ختم نہیں ہو گئے ہیں البتہ انکا گذشتہ اعتبار ختم ہو گیا ہے۔ ماضی میں جب کہ ابھی تجربی عقل پیدا نہیں ہوئی تھی معجزۂ و کرامت ایک مکمل طبیعی اور قابلِ قبول اور شک و شبہہ سے خالی و عاری سند ہوا کرتی تھی، لیکن پختہ فکر اور عقلی کمال حاصل کیے ہوئے انسان کے واسطے (دورِ خاتمیت کے انسان کے واسطے) یہ امور اب کوئی حجیّت و سندیت نہیں رکھتے لہٰذا چاہیے کہ ہر حادثہ کی طرح انھیں بھی عقلائی تجربہ کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔

خاتمیت سے قبل کا زمانہ معجزہ و کرامات کا زمانہ تھا یعنی معجزہ کرامت عقلوں کو اپنے زیرِ فرمان رکھتے تھے لیکن خاتمیت کا زمانہ عقل کا زمانہ ہے، عقل کرامت کے مشاہدہ کو کسی چیز کی دلیل نہیں مانتی مگر یہ کہ وہ اپنے معیاروں کے ساتھ الہام کے ذریعہ کسی کشف شدہ حقیقت کی صحت و اعتبار کو ظاہر کرے اقبالؔ کی گفتگو کا یہ حصہ بھی مخدوش ہے، دورِ خاتمیت کے قبل کے لحاظ سے بھی اور دورِ خاتمیت کے بعد کے لحاظ سے بھی۔

ہم بعد میں "معجزہ خاتمیت" کے عنوان سے اس کے متعلق بحث کریں گے۔ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ علامہ اقبالؔ نے وحی کو فطری قوّت کی قسم سے سمجھا ہے یہ بھی اشتباہ ہے اور یہی نظریہ ان کے دوسرے اشتباہات کا سبب ہوا ہے، فطری قوّت یا فطری شعور جس طرح کہ اقبال خود اس طرف متوجہ ہیں ایک سو فیصدی طبیعی (غیر اکتسابی) خاصیت ہے جو نا آگاہانہ اور حس و عقل کے مقابلہ میں بہت پست اور معمولی ہے، جس کو قانونِ خلقت نے حیوان (حشرات اور ان سے نچلے درجہ کے حیوانات) کے وجود کے ابتدائی مرحلوں میں بھی ودلیعت کیا ہے جو حس و عقل کی ہدایتوں کے رشد کے ساتھ کمزور پڑ جاتا ہے اور معطّل ہو جاتا ہے لہٰذا انسان جو فکری اعتبار سے حیوانات میں سب سے زیادہ بے نیاز ہے فطری شعور کے اعتبار سے حیوانات میں سب سے زیادہ کمزور ہے۔ لیکن اس کے برعکس

[۱]: احیاءِ فکرِ دینی در اسلام ص۱۴۶، ۱۴۷

"وحی"، حس وعقل کی راہنمائی سے بالاتر اور کسی حد تک اکتسابی ہے اور وحی کی آگاہی اور علم بدرجہا حس وعقل کی آگاہی اور بصیرت سے بالاتر ہے اور وہ معلومات جو وحی کے ذریعے سے کشف و آشکارا ہوتی ہیں عقل تجربی کی معلومات سے بے حد وسیع اور بہت ہی عمیق ہیں۔ ہم (مکتب، آیئڈیالوجی) کے بحث میں یہ ثابت کر چکے ہیں کہ انسان کی ساری فردی و اجتماعی صلاحیتوں، اجتماعی رابطوں کی پیچیدگیوں اور تکاملی رفتار کی انتہا معین نہ ہونے کے باوجود ہمیں یہ اعتراف کر لینا چاہیے کہ جس چیز کو اجتماعی مفکّروں اور فیلسوفوں نے "آیئڈیالوجی" کے نام سے پیش کیا ہے وہ گمراہی اور انسان کی شکست کے سوا کچھ نہیں آیئڈیالوجی کے لحاظ سے انسان کے لیے ایک راستہ سے زیادہ نہیں ہے اور وہ وحی سے حاصل شدہ آیئڈیالوجی ہے اور اگر ہم وحی کی آیئڈیالوجی کو قبول نہ کریں تو ہمیں قبول کر لینا چاہیے کہ انسان کے پاس کوئی آیئڈیالوجی نہیں ہے۔

آج کل کے مفکّرین یہ یقین رکھتے ہیں کہ بشر کے آئندہ سفر کی راہ معین کرنا انسانی آیئڈیالوجی کے وسیلہ سے صرف منزل بہ منزل کی شکل میں ممکن ہے یعنی صرف یہی صورت ممکن ہے کہ ہر منزل پر بعد والی منزل کی راہ معین کی جائے لیکن یہ کہ اس منزل کے بعد والی منزلیں کہاں ہیں اور سب سے آخری منزل کہاں اور کیا ہوگی؟ کچھ نہیں معلوم۔ ایسے اجتماعی نظریوں کا نتیجہ و سرانجام روشن و معلوم ہے۔

اے کاش! علامہ اقبال جو عارفین کے آثار (کتابوں)، کا کم و بیش مطالعہ رکھتے ہیں اور خصوصیّت سے مثنوی مولانا روم سے خاص ارادت وعقیدت رکھتے ہیں، ان کتابوں کا ذرا غور سے مطالعہ کرتے تو ختمِ نبوّت کے لیے بہتر سرمایۂ تحقیق حاصل کر سکتے۔ عُرفا نے اس نکتہ کو پالیا ہے کہ نبوّت کا سلسلہ اس حیثیت سے خاتمہ پذیر ہوا کہ انسان کے تمام انفرادی و اجتماعی مراحل و منازل اور وہ راستہ جس پر انسان کو چلنا چاہیے سب ایک ساتھ آشکارا ہو چکے، اب اس کے بعد انسان آیئڈیالوجی کے لحاظ سے جو چیز بھی کشف کرے وہ خاتم الانبیاءؐ کی معلومات سے زیادہ نہیں ہوگا اور وہ ناچار و مجبور ہے کہ انھیں کی پیروی کرے، "الخاتم من ختم المراتب باسرھا" خاتم وہ شخص ہوتا ہے جس نے تمام مراتب و درجات کو طے

کرلیا ہو اور کسی مرتبہ و منزل کو طے کرنا باقی نہ چھوڑا ہو۔ یہ ہے بحثِ ختمِ نبوّت کا دقیمتی) سرمایہ، نہ کہ انسانی معاشرہ کی عقلِ تجربی کی پختگی۔ علامہ اقبال اگر ان مردانِ خدا کے آثار و نگارشات پر (جن کے وہ عقیدت مند ہیں) غور و فکر کرتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ وحی فطری شعور نہیں ہے بلکہ وہ ایک روح اور حیات ہے جو عقلائی روح و حیات سے برتر و بلند تر ہے۔ مولانا روم کہتے ہیں:

۱۔ غیر فہم جان کہ در گاؤ و خر است — آدمی را عقل و جانِ دیگر است

وہ روح اور فہم جو گائے اور گدھے میں ہے — آدمی کو اور ہی عقل اور روح دی گئی ہے

۲۔ باز غیرِ عقل و جانِ آدمی — ہست جانے در نبیؐ و در ولی

پھر انسان کی عقل و روح سے مختلف — وہ روح ہے جو نبی اور ولی کو عطا ہوئی ہے

۳۔ جسم، ظاہر، روح مخفی آمدہ ست — جسم ہمچون آستین، جان ہمچون دست

جسم ظاہر ہوتا ہے اور روح پوشیدہ ہوتی ہے — جسم آستین کی طرح (ظاہر) ہے اور روح (آستین کے اندر چھپے ہوئے) ہاتھ کی مانند ہے۔

۴۔ باز عقل از روح مخفی تر بود — حس بسوئے روح زد تر رہ برد

پھر عقل ہے جو روح سے بھی زیادہ پوشیدہ ہوتی ہے — حس (عقل کی بہ نسبت) روح کی طرف زیادہ جلدی راستہ طے کرتی ہے

۵۔ روحِ وحی از عقل پنہاں تر بود — زانکہ او غیب است و او زان سر بود

(پھر) وحی کی روح عقل سے بھی زیادہ پوشیدہ ہوتی ہے — اسلیے کہ وہ غیبی چیز ہے جو اس سرے (عالم الغیب کی طرف) سے خاص تعلق رکھتی ہے

۶۔ عقل احمدؐ از کسے پنہاں نشد — روحِ وحیش مدرکِ ہر جان نشد

احمد مجتبیٰؐ کی عقل کسی سے پوشیدہ و مخفی نہیں رہی — (لیکن) حضرت کی وحی کی روح ہر روح کا مدرک نہیں ہوئی (یعنی حضرت کی وحی کی روح ہر شخص کے فہم و ادراک سے بالا تر تھی)

۷۔ روحِ وحی را مناسبہا است نیز — در نیابد عقل کاں آمد عزیز

وحی والی روح کے لیے کچھ مناسبات بھی ہیں — لیکن عقل اسکا ادراک نہیں کرسکتی کیونکہ وہ گرانقدر ادر

۸۔ لوحِ محفوظ است او را پیشوا — از چہ محفوظ است؟ محفوظ از خطا

لوحِ محفوظ کے ذریعہ اسکی (وحی کی) رہنمائی ہوئی ہے۔ — وہ کس چیز سے محفوظ ہے (اسے کیوں محفوظ کہا گیا ہے؟ کیونکہ) وہ خطاء سے محفوظ ہے

۹. نے نجوم است و نہ رمل است و نہ خواب   وحی   حق ، واللہ اعلم بالصواب

(وحی) نہ تو علم نجوم سے متعلق ہے اور نہ علم رمل سے اور نہ خواب ہے   بس وہ حق تعالیٰ کی وحی ہے اور اللہ ہی صحیح علم رکھتا ہے۔

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ علامہ اقبالؔ اپنے مذکورہ فلسفہ میں گویا اسی طرح اشتباہ سے دوچار ہوئے ہیں جس طرح سے مغربی دنیا ہوئی ہے، یعنی علم کو ایمان کا جانشین بنانا۔ بے شک وشبہ علامہ اقبال علم کی جانشینی کے نظریہ کے سخت مخالف ہیں — لیکن فلسفۂ ختمِ نبوّت میں انھوں نے جو راستہ اپنایا ہے وہ اسی نتیجہ تک پہنچتا ہے۔ اقبال وحی کی تعریف غریزہ (فطری شعور) قسم کی چیز سے کرتے ہیں اور اس امر کے مدّعی ہیں کہ کارخانۂ عقل و فکر کے چالو ہو جانے کے بعد غریزہ کا فریضہ انجام کو پہنچ جاتا ہے اور خود غریزہ خاموش ہو جاتا ہے، یہ بات صحیح تھی مگر اس صورت میں جب کہ فکر و اندیشہ اسی کام کو شروع کرتا جس کو غریزہ انجام دیتا تھا۔ لیکن اگر ہم یہ فرض کریں کہ غریزہ کا فریضہ کچھ ہے اور عقل و اندیشہ کا کچھ اور تو پھر اس امر کی کوئی دلیل نہیں کہ عقل و اندیشہ کے مشغول کار ہو جانے کے ساتھ ہی غریزہ اپنے کام سے معطل ہو جائے۔

پس اگر بالفرض ہم وحی کو ایک قسم کا غریزہ ہی سمجھیں اور یہ مان لیں کہ اس غریزہ کا کام ایک قسم کی جہاں بینی اور مسلک اجتماعی کا پیش کرنا ہے جس کا امکان عقل و اندیشہ کے پاس نہیں ہے تو پھر بھی اس امر کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ (بقول خود علامہ اقبال) عقل برہانی استقرائی کی پختگی کے ساتھ ہی غریزہ کا کام ختم ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبالؔ شہرت و سربلندی، علمی کمال اور اسلامی درد رکھنے کے باوجود اس لحاظ سے کہ وہ مغرب کے مدارس کے شاگرد تھے اور اسلامی علوم کی حیثیت ان کے لیے ثانوی (دوسرے درجے) تھی تحصیلات مغربی ذرائع اور مغربی ماحول میں تھی اور اسلامی علوم خاص کر فقہ و عرفان اور کسی قدر فلسفہ محض مطالعہ پر مبنی ہے (اسی وجہ سے) کبھی کبھی ایسی واضح غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ہم نے "اصول فلسفہ و روش رئالزم" (۱) کی جلد پنجم کے مقدمہ میں اقبال کی اس کمزوری کی طرف اشارہ

(۱): مطبوعہ سنہ ۱۳۵۰ ہجری شمسی۔

کیا ہے۔

اسی وجہ سے سیّد جمال الدّین اسد آبادی سے ان کا موازنہ کرنا صحیح نہیں ہے ایک تو سیّد جمال الدّین اپنے شخصی فضل و کمال کے لحاظ سے بھی ایک قدآور شخصیت ہے اور اسی کے ساتھ ان کی اصلی تعلیم اسلامی تھی اور مغربی تعلیم اور ثقافت ثانوی حیثیت رکھتی تھی اس کے علاوہ مرحوم سیّد جمال الدّین نے اسلامی ملکوں کے بہت دورے کیے تھے اور بہت ہی قریب سے ان ملکوں کے سیاسی و اجتماعی حالات کا مطالعہ کیا تھا لیکن اقبال کو یہ سب خصوصیات حاصل نہ تھیں اسی وجہ سے سیّد جمال الدّین اقبال کی طرح بعض اسلامی ممالک (از قبیل ایران و ترکیہ) کے سیاسی حالات میں اشتباہ سے دوچار نہ ہوئے۔

(۵) معجزۂ خاتمیّت

قرآن کریم حضرت ختمی مرتبتؐ کا ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ ہے، گذشتہ پیغمبران خدا از قبیل حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ جو آسمانی کتاب بھی رکھتے تھے اور معجزہ بھی، ان کے اعجاز نمائی کا موضوع ان کی کتابوں کے سوا دوسری چیزیں تھیں جیسے شعلہ ور آگ کا "بردو سلام" یعنی ٹھنڈک اور سلامتی سے بدل جانا، یا خشک لکڑی کا زندہ اژدہا بن جانا یا مردوں کو زندہ کر دینا، ظاہر سی بات ہے کہ ان معجزات میں سے ہر ایک وقتی و عارضی اور جلد ختم ہو جانے والا تھا، مگر حضرت خاتم الانبیاءؐ کے معجزہ کا موضوع خود حضرتؐ کی لائی ہوئی کتاب "قرآن مجید" ہے، حضرتؐ کی کتاب ایک ہی وقت میں کتاب بھی ہے اور آپ کی رسالت کی دلیل بھی اور اسی دلیل سے معجزہ ختمیہ۔ تمام پیغمبروں کے معجزات کے برخلاف۔ جاودانی اور ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ ہے، نہ کہ وقتی و عارضی

حضرت خاتم الانبیاء والمرسلینؐ کے معجزہ کا نوعِ کتاب سے ہونا ایک ایسی بات ہے جو آنحضرتؐ کے عصر اور زمانہ سے (جو علم و دانش، تہذیب و تمدن، علوم و معارف کی ترقی اور پیشرفت کا زمانہ ہے) مناسبت رکھتا ہے اور یہ ترقیاں اس بات کا امکان پیدا کرتی ہیں کہ اس کتاب کے بہت سے اعجازی گوشے تدریجاً روشن ہوں جو پہلے ظاہر نہیں ہوئے تھے، جس طرح سے اس کی ہمیشگی حضرت کے پیغام اور آپ کی رسالت کے دائمی اور ہمیشہ باقی رہنے سے متناسب ہے جو قیامت تک باقی رہنے والی اور ناقابلِ نسخ ہے۔ قرآن نے اپنے اعجاز اور فوق البشریت کے پہلو کی خبر اپنی چند آیتوں میں صریحاً دی ہے۔ [1]

جس طرح سے اس نے قرآن کے علاوہ خاتم الانبیاء کے دوسرے معجزات کے واقع ہونے کی تصریح کی ہے۔ قرآن کریم میں معجزات سے متعلق بہت سے مسائل بیان ہوئے ہیں جیسے پیغمبران الٰہی کی رسالت کا معجزہ کے ساتھ ہونے کی ضرورت اور یہ کہ معجزہ "بیّنہ" اور دلیلِ قاطع ہے اور یہ کہ انبیاء و رسل معجزہ کو "خدا کے اذن و اجازت سے" پیش کرتے ہیں اور یہ کہ پیغمبرانِ خدا اسی حد تک معجزہ پیش کرتے ہیں جو ان کے قول کی صداقت و سچائی کی دلیل اور نشانی ہو، وہ حضرات اس کے پابند نہیں ہیں کہ لوگوں کی خواہشات کی متابعت کریں اور لوگوں کے منشاء کے مطابق معجزات دکھاتے رہیں اور جو شخص جس روز اور جس وقت معجزہ کا مطالبہ کرے اسے فوراً قبول کرلیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ پیغمبروں نے "نمائشگاہِ معجزہ" قائم نہیں کی ہے اور معجزہ سازی کا کارخانہ نہیں کھول رکھا ہے اور بھی اسی طرح کے مسائل ہیں جو قرآن میں موجود ہیں۔

قرآن مجید نے جس طرح ان مسائل کو پیش کیا ہے اسی طرح بہت سے پیغمبران ماسبق جیسے حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ، حضرت صالحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے معجزات کو بھی پوری صراحت و وضاحت کے ساتھ نقل کیا ہے اور ان کی صحت کی گواہی دی ہے

(۱) "قل ان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فأتوا بسورة من مثله" اگر تم لوگ اس چیز کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندہ پر نازل کی ہے شک و تردد میں مبتلا ہو تو تم اس جیسا ایک سورہ ہی بنا کر لاؤ۔ (بقرہ ۲۳)

جو کسی بھی تاویل کے قابل نہیں ہے۔

بہت سے مستشرقین اور عیسائی علماء نے ایسی چند آیتوں کو جن کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن نے مشرکین کے ان کی خواہش کے مطابق معجزہ کے مطالبہ پر منفی جواب دیا ہے (انھیں آیتوں کو) بطور سند پیش کرتے ہوئے اس بات کا دعوٰے کیا ہے کہ "پیغمبر اسلام لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ میں قرآن کے سوا کوئی دوسرا معجزہ نہیں رکھتا، اگر تم قرآن کو بطور معجزہ قبول کرتے ہو تو بہتر ہے ورنہ میرے پاس کوئی دوسرا معجزہ نہیں ہے۔" بعض ادیب "روشن فکر" مسلمان مؤرخین نے بھی اخیراً اسی نظریہ کو قبول کرلیا ہے اور اس کی توجیہ اس شکل سے کی ہے کہ معجزہ قانع کنندہ دلیل ہے لیکن ان لوگوں کیلئے جو فکری اور عقلی لحاظ سے بالغ ورشید نہ ہوں اور جو اس قسم کے تعجب آور اور حیرت انگیز امور کی تلاش میں رہتے ہیں، لیکن بالغ ورشید اور پختہ عقل والا انسان اسطرح کے امور کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا اور اسے تو منطق سے سروکار ہوتا ہے، پیغمبر اسلامؐ کا دور عقل و منطق کا دور ہے، نہ کہ اوہام اور ذہنی تخیلات کا (اسی لیے) پیغمبر اسلام نے باذن خدا قرآن مجید کے علاوہ ہر قسم کے معجزہ کی درخواست قبول کرنے سے انکار فرمایا۔ وہ لوگ کہتے ہیں:-

"پیغمبران گذشتہ کا معجزات اور خارق عادات امور سے مدد لینا لازم و ضروری و ناگزیر تھا کیوں کہ اس دور میں ان حضرات کا عقلی دلیلوں کے ذریعہ رہنمائی کرنا بے حد دشوار بلکہ محال تھا...... پیغمبر اسلام کے ظہور کے زمانہ میں انسانی معاشرہ طفلی دور کو بہت پیچھے چھوڑ کر فکری بلوغ کے دور میں قدم رکھ رہا تھا، کل کا بچہ جو ایک ماں کا محتاج تھا تاکہ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے چلنا سکھائے، اب خود انسانی معاشرہ اپنے پاؤں پر سیدھا کھڑا ہو سکتا تھا اور اپنی عقل کو کام میں لا سکتا تھا..... پیغمبر اسلامؐ کا یہ عمل بغیر دلیل و حکمت نہیں تھا کہ منکرین و معاندین آپ سے معجزات و خرق عادات پیش کرنے پر اصرار کرتے ہیں لیکن آپ ان کی دعوت کو اجابت نہیں کرتے بلکہ اپنی دعوت کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لیے عقلی و تجرباتی اور تاریخی شواہد کے ذریعہ استدلال کرنے پر زور دیتے ہیں... منکرین کے اس تمام اصرار و لجاجت کے باوجود پیغمبرؐ اسلام ایسے معجزات (جیسے پیغمبرانِ گذشتہ پیش کیا کرتے تھے)

پیش کرنے سے بہ اذنِ خدا اجتناب کرتے تھے اور انکار فرما دیتے تھے اور صرف قرآن پر (ایسے معجزہ کی حیثیت سے جس کی نظیر نہیں ملے گی) اعتماد فرماتے تھے۔ حضرت خاتم الانبیاء کا معجزہ قرآن مجید رسالت کی خاتمیت کی بھی دلیل ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو عالم خلقت کے حقائق اور تمام جہات میں کمال ہم آہنگی کے ساتھ زندگی کی تعلیمات اور رہنمائیوں پر مشتمل ہے ایک ایسا معجزہ ہے جو بالغ و رشید انسان کے لیے مفید ہے نہ کہ اس بچے کے لیے جو اوہام اور ذہنی تخیلات کا پابند ہو۔" (۱)

بعض کہتے ہیں: " وہ فضا جس میں گذشتہ انسان سانس لیتا رہا ہے ہمیشہ خرافات و موہومات وخوارق عادات سے بھری رہی ہے اور سوائے اس چیز کے جو عقل و ادراک کے خلاف ہو ان کے ذہن میں اثر ہی نہیں کرتی تھی، یہی وجہ ہے کہ ہم تاریخ میں بشریت کو دیکھتے ہیں کہ وہ ہمیشہ " اعجاز " کی تلاش و جستجو میں مصروف اور " غیب " کی شیفتہ و دلدادہ رہی ہے، یہ حساسیت ہر اس چیز کے بارے میں جو عقل و سمجھ میں نہ آنے والی ہو ان انسانوں میں بہت زیادہ پائی جاتی ہے جو تمدن سے زیادہ دور ہوتے ہیں، یہ لوگ " طبیعت " سے جتنے زیادہ نزدیک ہیں اتنے ہی زیادہ " ماوراء طبیعت " کے مشتاق رہتے ہیں، اور بیہودگی و فضول گوئی اسی حقیقت کی معیوب اولاد ہے، صحرائی انسان ہمیشہ " معجزہ " کی تلاش میں رہتا ہے اس کی دنیا حیرت انگیز ارواح و اسرار سے بھری ہوئی ہے...... گذشتہ انسان کی روح فقط اس وقت متأثر ہوتی تھی جب اس کی نگاہوں کے سامنے کوئی تعجب خیز امر واقع ہو رہا ہو، جس کو وہ رمز سے پُر، سحر انگیز اور مُبہم چیز سمجھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ نہ صرف تمام پیغمبر بلکہ تمام بادشاہ، تمام طاقت ور اور ہر قوم کے حکماء اپنے افکار اور اعمال کی توجیہ عجیب و غریب و خارق العادت امور سے کرتے رہے ہیں اور اس میں پیغمبروں کا گروہ جن کی رسالت کی بنیاد ہی " غیب " پر رکھی گئی ہے انھیں دوسروں سے زیادہ ضرورت تھی کہ معجزہ سے کام لیں کیونکہ ان کے زمانہ کے لوگوں کے ایمان میں " اعجاز " منطق و علم اور محسوس و مسلّم عینی حقیقت سے زیادہ کارآمد تھا۔ لیکن محمدؐ کی بات اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہے، وہ معاشرہ جس کے ترقی یافتہ سب سے بڑے تجارتی شہر میں صرف سات آدمی لکھنا پڑھنا جانتے

(۱) : ڈاکٹر حبیب اللہ پائدار " فلسفۂ تاریخ از نظر قرآن " ص ۱۶۴، ۱۶۵

تھے اور "خاندانی فخر، شمشیر زنی، سرمایہ، دولت، اونٹ اور اولاد (وہ بھی) لڑکے" کے سوا کچھ سوچتے ہی نہیں تھے، ایسے معاشرہ میں آپ "کتاب" کو اپنا معجزہ اعلان کرتے ہیں یہ بات خود ایک معجزہ ہے"، "کتاب"!۔ ایسے ملک میں جہاں "تاریخ کتاب کے کسی ایک نسخہ کا سراغ نہیں دیتی۔ اس کا خدا روشنائی "قلم" اور "تحریر" کی قسم کھاتا ہے، ایسی قوم جو قلم کو چند بدحال، عاجز اور بے افتخار افراد کا وسیلہ سمجھتی ہے یہ خود ایک "معجزہ" ہے...... . کتاب اکیلا وہ معجزہ ہے جس کو ہمیشہ دیکھا جا سکتا ہے اور ہر روز اس کو مزید آسودہ کرنے والا معجزہ پایا جا سکتا ہے اور یہ وہ تنہا معجزہ ہے جس کو دوسرے معجزات کے برخلاف عقلمند اور دانشمند انسان اور ہر وہ معاشرہ جو زیادہ ترقی یافتہ اور زیادہ متمدّن ہو وہ سب اس کے اعجاز کو زیادہ درست، زیادہ صحیح اور زیادہ عمیق پائیں گے۔

یہ کتاب وہ اکیلا معجزہ ہے جس پر اعتقاد رکھنا صرف امور غیبی کے معتقدین ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس کے اعجاز کا ہر مفکّر معترف ہے، یہ وہ تنہا معجزہ ہے جو نہ صرف عوام کے لیے بلکہ روشنفکروں کے لیے بھی ہے،...... وہ تنہا معجزہ ہے جو دوسرے معجزات کے برخلاف اپنے دیکھنے والوں کے صرف اعجاز و اعجاب کی حس کو حرکت میں لانے کے لیے نہیں ہے، ایک رسالت کو قبول کرنے کے واسطے صرف ایک مقدمہ اور ایک وسیلہ نہیں ہے بلکہ اس پر یقین کرنے اور ایمان لانے والوں کی تعلیم و تربیت کے واسطے ہے، یہ خود قبول کرنے کا مقصد ہے، خود رسالت ہے اور بالآخر محمدؐ کا یہ معجزہ مقولۂ امور "غیر بشری" سے نہیں ہے اگرچہ ایک غیر بشری عمل ہے اور اس لحاظ سے گذشتہ (انبیاء) کے معجزات کے برخلاف، جو لوگوں کے یقین کرنے کے واسطے صرف ایک عامل و سبب کے طور پر کام میں لائے جاتے رہے۔ (وہ بھی چند گنے چنے افراد کے لیے جو انھیں دیکھتے تھے) اور اس کے علاوہ ان معجزات کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

محمدؐ کا معجزہ بلند ترین انسانی استعداد و صلاحیت کی نوع سے ہے اور انسان کے بلند ترین نمونۂ کار و دستور العمل کی حیثیت سے کام آسکتا ہے۔ ایسا دستور العمل جو ہمیشہ اس کے قبضہ و اختیار

میں ہے ...... محمدؐ کوشش کرتے ہیں کہ لوگوں کے تفحص اور انکی تلاش وجستجو کا رُخ، غیر عادی امور، کرامات اور خوارق عادات سے (موڑ کر اسے) عقلی و منطقی، علمی و طبیعی اور اجتماعی و اخلاقی مسائل کی طرف متوجہ کردیں اور انکی حساسیت کے رخ کو "عجائب و غرائب" (کی طرف) سے ہٹاکر" واقعیات وحقائق" کی طرف موڑ دیں اور یہ کوشش معمولی چیز نہیں ہے وہ بھی ایسے لوگوں کے ساتھ جو غیر طبیعی چیزوں کے سوا کسی چیز کے سامنے جھکنا اور کسی چیز کو ماننا جانتے ہی نہیں پھر مزید برآں ایسے شخص کے ذریعہ جو اپنے کو ان کے درمیان پیغمبر کہتا ہے، اپنے کو پیغمبر بتانا اور لوگوں کو اپنی خدائی رسالت کی طرف دعوت دینا اور عین اسی حالت میں آئینی طور پر یہ اعتراف و اعلان کرنا کہ "میں غیب کی خبر نہیں رکھتا"، تعجب میں ڈال دینے والا کام ہے اور آپ کی انسانی قدر و منزلت کے علاوہ جو چیز بہت زیادہ ہیجان پیدا کرنے والی ہے وہ آپ کی خارق العادۃ سچائی ہے جس کا احساس آپ کے کام میں ہوتا ہے اور جو ہر دل کو تقدیس کے لیے اور ہر فکر کو تعظیم اور تحسین و تعریف پر آمادہ کرتی ہے۔

آپ سے پوچھتے ہیں، اگر آپ پیغمبر ہیں تو مال تجارت کا نرخ (بازار بھاؤ) ہمیں (پہلے سے) بتا دیں تاکہ ہم اپنی تجارت میں نفع حاصل کریں، قرآن آپ کو حکم دیتا ہے کہ "تم کہہ دو! کہ میں اپنی ذات کے لیے نہ نفع کا مالک ہوں اور نہ نقصان کا سوائے اس کے جو خدا کو منظور رہو، اگر میں غیب کی خبر رکھتا تو بہت زیادہ نیکیاں کرتا اور کوئی خرابی مجھے چھو بھی نہ جاتی، میں تو ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں فقط ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں"۔ [1]

لیکن جو پیغمبر (غیب دان و) غیب گو نہ ہو اور جو روحوں، پریوں اور جنّات سے گفتگو نہ کرے اور روزانہ جس سے کوئی کرامت ظاہر نہ ہو، وہ صحرائی لوگوں کی نظر میں کیا وقعت و اہمیت رکھ سکتا ہے، محمدؐ انھیں کائنات کے بارے میں غور و فکر، طہارت، دوستی، علم، وفا اور آدمی کے وجود اور زندگی اور قسمت و سرانجام کے معنی سمجھنے کی طرف بلاتے ہیں اور وہ لوگ آپ سے پے در پے معجزہ طلب کرتے ہیں اور غیب گوئی اور کرامت کی خواہش کرتے ہیں اور خدا آپ ہی کی زبان سے ایسے لہجہ میں کہ گویا ایسے

[1]: سورۂ اعراف ۱۸۸

کام کی آپ سے ہرگز ہرگز توقع و امید نہیں کی جا سکتی، فرماتا ہے "سبحان ربی ھل کنت الا بشرا رسولا" سبحان اللہ کیا میں ایک بھیجے ہوئے بشر کے سوا کچھ اور ہوں؟ (سورۂ اسراء ۹۳) [۱]

اس گروہ نے زیادہ تر جن آیات کو بطور سند اختیار کیا ہے وہ قرآن مجید کی آیات سورۂ اسراء ۹۰-۹۳ ہیں جن میں ارشاد خداوندی ہے :-

" وَقَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوعًا أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِنْ نَخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِنْ زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ وَلَنْ نُؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَقْرَؤُهُ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا "

" وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو آپ کی تصدیق نہیں کریں گے جب تک کہ تمہارے لیے زمین سے کوئی چشمہ جاری نہ کر دیں یا آپ کے پاس خرما اور انگور کا کوئی باغ نہ ہو جس میں آپ نہریں جاری کر دیں یا جیسا کہ آپ گمان کرتے ہیں ہمارے اوپر آسمان کا کوئی ٹکڑا نہ گرا دیں یا خدا اور ملائکہ کو ہمارے روبرو حاضر نہ کر دیں یا آپ کے پاس سونے کا گھر نہ ہو یا آپ آسمان پر نہ چڑھ جائیں اور آپ کے چڑھ جانے پر ہم ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ آپ ہم پر کوئی خط نہ نازل کر دیں جس کو ہم پڑھیں ۔ (اے رسول آپ) کہہ دیجئے کہ پاک و منزہ ہے میرا پروردگار کیا میں ایک بھیجے ہوئے بشر کے علاوہ کچھ اور ہوں "

یہ لوگ (بعض روشنفکر مسلمان مؤرخین) کہتے ہیں کہ یہ آیتیں ظاہر کرتی ہیں کہ مشرکین پیغمبرؐ سے قرآن کے علاوہ کوئی معجزہ چاہتے تھے اور پیغمبرؐ ایسا معجزہ پیش کرنے سے امتناع و اجتناب کرتے تھے۔ اور جن مطالب کو ہم نے نقل کیا ہے ان میں سے بعض اور خاص کر اس خیال کو کہ کتاب (قرآن) تمام معجزات سابقہ سے برتر ہے) کی تائید کرتے ہوئے ہیں افسوس ہے کہ ہم ان مذکورہ تمام نظریات کی موافقت نہیں کر سکتے، ہماری نظر میں جو مسائل قابل بحث ہیں وہ حسب ذیل ہیں ۔

(۱) پیغمبر اسلامؐ قرآن مجید کے علاوہ کوئی دوسرا معجزہ نہیں رکھتے تھے اور قرآن کے علاوہ کوئی

[۱] : ڈاکٹر علی شریعتی (مرحوم) " اسلام شناسی " ص ۵۰۲-۵۰۶

دوسرا معجزہ طلب کرنے والوں کے اصرار کے باوجود ان کی بات کو قبول نہیں کرتے تھے سورۂ اسراء کی آیتیں اس امر کی شاہد ہیں۔

(۲) اعجاز کی قدر و قیمت اور افادیت کتنی ہے؟ آیا معجزہ اور امر خارق العادت ایسی چیز تھی جو انسان کے عہد طفلی کے دور سے جبکہ عقل و منطق کارآمد نہیں تھی مناسبت رکھتی تھی اور ہر شخص یہاں تک کہ حکماء اور بادشاہ ان امور کے ذریعہ اپنے اعمال و کردار کی توجیہ کرتے رہے ہیں، پیغمبرانِ خدا بھی مجبور تھے کہ ان امور کے ذریعہ اپنی تعلیمات حق کی توجیہ کریں اور لوگوں کو مطمئن کریں۔ پیغمبرؐ اسلام جن کا معجزہ "کتاب" ہے اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں آں حضرتؐ نے کتاب اور درحقیقت عمل و منطق کے ذریعہ اپنے کو پہچنوایا۔

(۳) پیغمبرؐ اسلام کوشش کرتے ہیں کہ لوگوں کو امورِ غیر عادی، کرامات اور خوارق عادات سے عقلی و منطقی مسائل کی طرف متوجہ فرمائیں اور ان کی حساسیت کو "عجائب و غرائب" سے "واقعیت و حقائق" کی طرف موڑ دیں۔ اب ہم ان تینوں نظریوں پر بحث و جستجو و گفتگو کرتے ہیں:

قرآن مجید کے علاوہ کوئی معجزہ!

کیا پیغمبرؐ اسلام قرآن کے سوا کوئی معجزہ نہیں رکھتے تھے؟ یہ مسئلہ علاوہ اس کے کہ تاریخ و سنّت و حدیث متواتر کے لحاظ سے ناقابلِ قبول ہے، نصّ قرآن کریم کے بھی خلاف ہے، معجزۂ شق القمر کا ذکر خود قرآن میں آیا ہے، بالفرض اگر کوئی "چاند کے دو ٹکڑے" ہونے کی توجیہ و تأویل کرے (اگرچہ وہ ہرگز تاویل کے قابل نہیں ہے)، تو معراج کے واقعہ اور سورۂ اسراء کی توجیہ و تعبیر کیونکر کی جا سکتی ہے؟ قرآن صاف صاف لفظوں میں کہتا ہے "سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ الذی بارکنا حولہ لنریہ من آیاتنا" "پاک و بے نیاز ہے وہ ذات جو اپنے بندہ کو راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ (بیت المقدس) تک لے گئی جس

کے گرد ہم نے برکتیں نازل کی ہیں تاکہ ہم اسے اپنی نشانیاں دکھائیں"، کیا یہ واقعہ ایک امر خارق عادت اور معجزہ نہیں ہے؟ سورۂ مبارکہ تحریم میں[1] "پیغمبر خدا کا ایک راز کی بات اپنی بیوی سے کہنا اور پھر اس بیوی کا اس راز کو حضرت کی ایک دوسری بیوی سے کہہ دینا" قصہ بیان ہوا ہے کہ پیغمبرؐ نے اس بیوی سے کہا کہ تو نے وہ راز دوسری بیوی سے کیوں کہا؟ پھر ان دونوں بیویوں کے درمیان جو باتیں ہوئی تھیں انکو حضرت نے دہرا دیا تو اس بیوی نے تعجب سے پوچھا کہ آپکو اس کی خبر کس نے دی؟ رسول اکرمؐ نے فرمایا مجھے میرے خدا نے آگاہ کر دیا۔ کیا یہ غیب کی خبر نہیں ہے؟ معجزہ نہیں ہے؟ سورۂ اسراء کی آیات ۹۰-۹۳ اور بعض دوسری اس قسم کی آیتیں جو بطور سند پیش کی جاتی ہیں ان کا قصہ دوسری نوعیت کا ہے وہاں معجزہ بہ معنی "آیت" نشانی اور "بیّنہ" دلیل، طلب کرنے کا مسئلہ ان لوگوں کی طرف سے نہیں ہے جو واقعاً تردّد کی حالت میں ہوں اور ثبوت کے لیے دلیل و برہان کے خواہشمند ہوں، یہ آیتیں اور سورۂ عنکبوت کی آیت ۵۰[2] مشرکوں کی خاص منطق کو معجزہ خواہی میں اور قرآن کی خاص منطق کو پیغمبروں کے معجزہ کے فلسفہ میں ظاہر و روشن کرتی ہیں۔

سورۂ اسراء کی آیات ۹۰-۹۳ میں مشرکوں کی بات اس طرح شروع ہوتی ہے: لن نؤمن لك .... حتّٰی تفجر لنا .... یعنی ہم آپ کے فائدہ کے لیے آپ پر ایمان نہیں لائیں گے اور آپ کے گروہ میں شامل نہیں ہوں گے مگر یہ کہ آپ "ہمارے فائدہ کے لیے" ہمارے سامنے، اس خشک و سنگلاخ (پتھریلی) زمین پر زمین سے کوئی چشمہ جاری کر دیں۔ یعنی

[1]: واذ اسر النبی الی بعض ازواجه حدیثا فلما نبأت به واظهره الله علیه عرف بعضه واعرض عن بعض فلما نبأها به قالت من انبأك هٰذا؟ قال نبأنی العلیم الخبیر ہ (سورۂ تحریم ۳)
لیعنی جس وقت پیغمبرؐ نے اپنی ایک بیوی کو ایک راز کی بات بتائی، پس جوں ہی اس بیوی نے وہ راز دوسری بیوی کو بتایا خدا نے پیغمبرؐ کو اس افشاء راز کی خبر کر دی، ان میں سے کچھ باتوں کو دہرا دیا اور کچھ باتوں کو بیان نہیں کیا پھر جب نبی نے اس بیوی کو اس بات سے مطلع کیا تو اس نے کہا کہ آپ کو اس کی خبر کس نے دی؟ پیغمبرؐ نے فرمایا کہ مجھے اس ذات نے آگاہ کیا جو بڑا جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔

[2]: اس آیت کے بارے میں ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔ مؤلف (ت ہ)

ایک معاملہ (لین دین) یا درختوں سے بھرا ہوا گھنا باغ جس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں، یا آپ سونے سے بھرا ہوا گھر رکھتے ہوں (جس سے ہم بھی فائدہ حاصل کر سکیں یعنی پھر ایک معاملہ یا آپ آسمان کا ایک ٹکڑا (جیسا کہ آپ گمان کرتے ہیں کہ قیامت کے دن ایسا ہوگا) ہمارے اوپر گرادیں یعنی عذاب اور موت اور سرکشی کا نتیجہ، نہ کہ معجزہ، یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے حاضر کریں یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں اور ہمارے واسطے اور ہمارے نام اور فخر کے واسطے خصوصی خط بھیجیں پھر ایک معاملہ۔ (لیکن روپے پیسے کا نہیں۔ بلکہ عنوانی، تفاخری، موضوع کے محال ہونے کی طرف توجہ کیے بغیر)

مشرکین نے یہ نہیں کہا کہ " لن نؤمن بك .... جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ جب تک فلاں معجزہ پیش نہ کریں گے ہم آپ پر ایمان نہیں لائیں گے، بلکہ انھوں نے تو کہا کہ " لن نؤمن لك "، جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم آپ کے فائدہ کے لیے آپ کے گروہ میں شامل نہیں ہوں گے۔ یعنی ایک مصلحت آمیز تصدیق۔ عقیدہ کا ایک لین دین، " آمَنَ بِهٖ " اور " آمَنَ لَهٗ " میں فرق ہے، اصول فقہ کے علماء نے سورۂ توبہ کی آیت ۶۱ جس میں رسول اکرمؐ کے بارے میں ہے کہ " یؤمن باللہ ویؤمن للمؤمنین " سے اسی لطیف و باریک نکتہ کا استنباط کیا ہے، مشرکین نے جن چیزوں کو اس تصدیق وتائید مصلحتی کے مقابلہ میں طلب کیا تھا ان کے علاوہ ایک مطالبہ " تفجر لنا من الارض ینبوعا " کی عبارت میں پیش کیا ہے یعنی آپ ہمارے فائدہ کے لیے ایک چشمہ جاری کردیں " ظاہر سی بات ہے کہ یہ ایک " مزدوری " طلب کرنا ہے نہ کہ دلیل وبیّنہ خواہی ومعجزہ خواہی۔

پیغمبرؐ کی غرض بعثت یہ ہے کہ وہ لوگوں کو واقعی مومن بنائیں نہ یہ کہ معجزہ کی قیمت کے عوض لوگوں کا عقیدہ خریدیں۔ خود مؤرخ محترم (۱) یہ لکھتے ہیں کہ " وہ لوگ پیغمبر سے کہتے تھے کہ اگر آپ پیغمبرؐ ہیں تو بازار کا نرخ (بازار بھاؤ) ہمیں پہلے سے بتادیا کریں تاکہ ہم اپنی تجارت میں نفع حاصل کریں " اس سے واضح ہوتا ہے کہ " یہ کشف حقیقت کے لیے معجزہ طلب کرنا یا بیّنہ خواہی نہیں ہے، بلکہ پیغمبر کو روپیہ حاصل کرنے کا وسیلہ و ذریعہ بنانا ہے، ظاہر سی بات ہے کہ پیغمبر کا جواب یہی ہوگا کہ اگر خدا مجھے (ایسی باتوں کے لیے)

(۱): ڈاکٹر علی شریعتی (مرحوم)

غیب سے آگاہ کیسے ہوتا تو میں اس دغیب دانی کو خود اپنے دنیاوی کاموں کے لیے وسیلہ و ذریعہ بناتا لیکن معجزہ اورغیب دانی ان کاموں کا وسیلہ نہیں ہے. میں پیغمبر ہوں ، خوشخبری دینے والا اور ڈرانیوالا.

مشرکین یہ گمان کرتے تھے کہ معجزہ ایسی چیز ہے جو پیغمبر کے اختیار میں ہے ، وہ جسوقت چاہیں اورجس طرح چاہیں اورجس مقصد کے لیے چاہیں معجزہ دکھا سکتے ہیں ، یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ آپ سے چشمہ جاری کرنے ، سونے کا گھر رکھنے ، پہلے سے قیمتوں کی خبر دینے کا مطالبہ کرتے تھے ،جبکہ حقیقت یہ ہے کہ معجزہ خود وحی کے مانند ہے ، اُس طرف سے وابستہ ومتعلق ہے نہ کہ اِس طرف سے ،جس طرح سے کہ وحی پیغمبر کی خواہش کی تابع نہیں ہے بلکہ اُس طرف سے ایک فیضان ہوتا ہے جو پیغمبر کو اپنے زیراثر رکھتا ہے اسی طرح معجزہ بھی اُس طرف سے ایک فیضان ہے جو پیغمبر کے ارادہ کو اپنے زیرِاثر رکھتا ہے اور پیغمبر کے ذریعہ سے جاری ہوتا ہے .

یہ ہے مطلب اس فقرہ کا کہ وحی باذن اللہ ہوتی ہے اور معجزہ بھی باذن اللہ ظاہر ہوتا ہے اور یہی مطلب ہے سورۂ عنکبوت کی آیت ۵۰ کا جس سے راہبان وعلماء مسیحی غلط فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں" انّما الآیات عند اللہ وانّما انا نذیرٌ مبینٌ (نشانیاں اور معجزات تو خدا کے پاس ہیں اور میں تو فقط ظاہر بظاہر ڈرانے والا ہوں،

معجزہ کے عنوان سے غیب کی خبر دینا بھی ایسا ہی ہے ، یہ امر جہاں تک پیغمبرؐ کی ذات وشخصیّت سے متعلق ہے آپ غیب سے بے خبر ہیں" قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب و لا اقول لکم انی ملکٌ" (الانعام ۵۰) (اے رسول، کہہ دو کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور میں غیب بھی نہیں جانتا اور میں تم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں) لیکن جہاں سے پیغمبرؐ غیب اور ماوراء طبیعت کے زیراثر و نفوذ ہوتے ہیں وہاں پوشیدہ رازوں کی خبر دیتے ہیں اور جب آپ سے سوال کیا جاتا ہے کہ آپ نے کہاں سے اور کیسے جانا تو فرماتے ہیں کہ خدائے علیم وخبیر نے مجھے خبر دی ہے . اگر پیغمبر یہ فرماتے ہیں کہ" میں غیب نہیں جانتا اور اگر میں غیب داں

ہوتا تو بہت سی دولت اس کے ذریعہ سے حاصل کرلیتا" (لوکنت اعلم الغیب لاستکثرت الخیر)[1]
اس بات سے حضرتؐ یہ چاہتے ہیں کہ مشرکوں کی بات کا منہ توڑ جواب دیں کہ میرا غیب جاننا معجزہ کی حد میں ہے اور ایک خاص مقصد اور وحی الٰہی کے وسیلہ سے ہے اگر میری غیب دانی میرے اپنے اختیار میں ہوتی اور اسے ہر مقصد کے واسطے کام میں لایا جا سکتا اور اس کے وسیلہ سے جیبیں بھرنا ممکن ہوتا تو بجائے اس کے کہ تمہیں نرخوں کے متعلق پیشگی خبر دیتا خود ہی اپنی جیب بھرتا۔ قرآن مجید ایک دوسری آیت میں کہتا ہے " عالم الغیب لا یظهر علی غیبه احداً الا من ارتضیٰ من رسول" (سورہ جن، ۲۶،۲۷) خداوند عالم غیب کا جاننے والا ہے، وہ کسی کو اپنے غیب سے آگاہ نہیں کرتا سوائے اس رسول کے جس کو اس کی رضایت وخوشنودی حاصل ہو"

یقیناً رسول اکرمؐ ان رسولوں میں سے ایک ہیں جنھیں اس کی خوشنودی حاصل ہے ان سب باتوں سے قطع نظر، قرآن نے اپنی بہت سی آیات میں پیغمبروں کے معجزات کو بیان کیا ہے حضرت ابراہیمؑ کے معجزات، حضرت موسیٰؑ و عیسیٰؑ وغیرہ کے معجزات، اس صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ جس وقت پیغمبرؐ اسلام سے لوگ معجزہ کے طالب ہوں جس طرح سے کہ گذشتہ پیغمبروں سے لوگ معجزہ مانگتے تھے اور وہ پیغمبر قبول کرتے اور معجزہ پیش کرتے تھے اور پیغمبر فرمائیں" سبحان اللہ! میں ایک بھیجے ہوئے بشر سے زیادہ کچھ نہیں ہوں کیا وہ لوگ (مشرکین) یہ بات کہنے کا حق نہیں رکھتے تھے؟ آیا وہ سب پیغمبران گذشتہ جن کے معجزات تم خود نہایت آب و تاب کے ساتھ نقل کرتے ہو، بشر نہیں تھے؟ یا پیغمبر نہ تھے؟ آیا ممکن ہے کہ ایسا صریح تناقض قرآن مجید میں پایا جائے؟ آیا ممکن ہے کہ مشرکین ایسے تناقض کی طرف متوجہ نہ ہوئے ہوں؟

اگر روشن فکری کی یہ منطق صحیح ہو، تو پیغمبر کو بجائے اس کے کہ فرمائیں" سبحان اللہ! میں ایک بشر سے زیادہ نہیں ہوں، یہ فرمانا چاہیے تھا کہ سبحان اللہ! میں خاتم المرسلؐ ہوں، میں دوسرے پیغمبروں کے قاعدہ سے مستثنیٰ ہوں، مجھ سے ان باتوں کا مطالبہ نہ کرو جن کا مطالبہ گذشتہ پیغمبروں

[1] اعراف، ۱۸۸

سے ان کی امت والے کیا کرتے تھے، نہ یہ کہ یہ فرمائیں کہ میں بھی ایک رسول ہوں تمام رسولوں کی طرح ۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین جو چیز پیغمبرؐ سے طلب کرتے تھے، وہ معجزہ یعنی حقیقت کو معلوم و متیقن کرنے کی غرض سے، آیت و بینہ، نشانی و دلیل ـــ حقیقت کی تلاش کرنے والوں کو جس کا حق حاصل تھا کہ اس کو پیغمبری کا دعوےٰ کرنے والے سے طلب کریں ۔ نہیں تھا، بلکہ وہ ایسی چیز تھی کہ عام طور سے پیغمبروں کی شان کے خلاف تھا کہ ایسی درخواستوں کو قبول کریں، یہی وجہ ہے جسکی بنا پر پیغمبرؐ نے فرمایا کہ " سبحان اللہ ! میں لشر اور رسول سے زیادہ نہیں ہوں "

یعنی جو چیز تم مجھ سے چاہتے ہو وہ ایسی چیز نہیں ہے جسے ایک حقیقت کی جستجو کرنے والا رسولوں اور پیغمبروں سے طلب کرے اور رسولوں پر لازم ہو کہ اس کا مثبت جواب دیں، یہ تو ایک دوسری چیز ہے، یہ ایک قرار داد اور معاملہ ہے یہ صرف مجھے دیکھنا اور خدا کو نہ دیکھنا ہے اور (خدا سے بے توجہ و بے نیاز ہوکر) مستقلاً مجھ سے چیز مانگنا ہے، یہ اظہار تکبر اور خود خواہی اور دوسروں کے مقابلہ میں اپنے واسطے امتیاز ثابت کرنا ہے، یہ امور محال کے ایک سلسلہ کا مطالبہ و تقاضا ہے اور..

مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ عوام کی خواہش اور ان کا میلان ہمیشہ معجزہ سازی کی طرف ہوتا ہے نہ صرف پیغمبروں اور اماموں کے واسطے، بلکہ ہر قبر ہر پتھر اور ہر درخت کے واسطے ۔ لیکن کیا یہ وجہ اس امر کا سبب ہو جائیگی کہ ہم پیغمبرؐ کے لیے (سوائے قرآن کے) ہر معجزہ و کرامت کو منتفی سمجھ لیں؟ اس کے علاوہ، معجزہ اور کرامت کے درمیان فرق ہے، معجزہ یعنی الٰہی دلیل و نشانی جو خدا کی طرف سے مامور ہونے کو ثابت کرنے کے لیے وجود میں آتا ہے اور اصطلاح میں مقرون با لتحدّی (یعنی اس چیلنج کے ساتھ ہوتا ہے کہ کوئی بھی اگر اس کا مثل لا سکتا ہو تو لائے ۔ مترجم) اس کے لیے کوئی الٰہی مقصد ضروری ہے اس لیے وہ چند شرطوں کے ساتھ مخصوص ہے اور کرامت بھی ایک خارق عادت امر ہے جو صرف اثر و نتیجہ ہوتا ہے اس روحانی قوت اور نفسی پاکیزگی کا جو کسی انسان کامل یا نیم کامل میں پیدا ہو جاتی ہے اور یہ کسی الٰہی مقصد کے اثبات کے لیے مخصوص نہیں

ہے ، ایسے امور (جنھیں کرامت کہا جاتا ہے اور کرامت کی تعریف میں آتے ہیں) بہت زیادہ وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک عادی امر ہے اور کسی شرط سے مشروط نہیں ہے ، معجزہ خدا کی زبان ہے جو کسی شخص کی تائید کرتی ہے ، لیکن کرامت ایسی زبان نہیں ہے۔

اعجاز کی قدر و قیمت اور افادیّت !

اعجاز کی اہمیت و قدر و قیمت اور افادیت کتنی ہے ؟ علمأ منطق و فلسفہ نے ان موادّ و مطالب کو جو کسی استدلال کے موقع پر کام میں لائے جاتے ہیں انکی قدر و قیمت کے لحاظ سے چند قسموں پر تقسیم کیا ہے ۔ ان عناصر میں سے بعض برہانی اہمیّت رکھتے ہیں اور علمی و عقلی تردید کی گنجائش باقی نہیں چھوڑتے ۔ جیسے وہ موادّ و عناصر جنھیں ایک ریاضی داں (حساب جاننے والا) اپنے استدلالوں میں استعمال کرتا ہے ، بعض دوسرے عناصر و اجزاء اقناعی حیثیت رکھتے ہیں (یعنی اطمینان بخش ہوتے ہیں) جیسے وہ عناصر و مواد جن کو مقررین و خطباء اپنی تقریروں میں کام لاتے ہیں جن کے بارے میں اگر موشگافی کی جائے (یعنی بہت دقّت و باریک بینی سے کام لیا جائے) تو بسا اوقات وہ استدلال صحیح نہیں ہوتا ، لیکن اگر ان کی موشگافی نہ کی جائے تو عملاً ایک حرکت و بیداری پیدا کرتے ہیں ، بعض اجزاء و عناصر میں صرف ہیجان پیدا کرنے والی اور احساساتی کیفیت ہوتی ہے اور بعض عناصر دوسری کیفیّتوں اور اہمیّتوں کے حامل ہوتے ہیں ۔

اعجاز کی اہمیّت و افادیّت قرآن کی نظر میں کیا ہے ؟

قرآن مجید جس طرح آثارِ خلقت کو " خدا کی نشانیاں " اور خدا کے وجود کی ناقابل تردید قطعی دلیل سمجھتا ہے اسی طرح انبیاء کے معجزات کو بھی کھلی ہوئی نشانیوں " کے عنوان سے بیان کرتا ہے اور انھیں

ان کے پیش کرنے والوں (انبیاء) کے دعووں کی سچائی پر دلیل قاطع اور عقلی و منطقی مسلّم دلیل شمار کرتا ہے۔

قرآن کریم نے معجزہ کے بارے میں تفصیل سے بحث کی ہے اور پیغمبروں سے ان لوگوں کے تقاضا معجزہ کو جو بغیر دلیل و بیّنہ کے (دعوائے نبوّت کی) تصدیق کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ معقول و منطقی قرار دیا ہے اور پیغمبروں کی طرف سے مثبت اور عملی جواب کو بڑی آب و تاب کے ساتھ نقل کیا ہے اور بہت سی آیتوں کو اس کے لیے مخصوص کیا ہے، قرآن مجید نے اس امر کی طرف معمولی سا اشارہ بھی نہیں کیا ہے کہ معجزہ صرف ان سادہ لوح و معمولی اور عامیانہ ذہنوں کے لیے (جو بشر کے دورِ طفلی سے مناسبت رکھتے ہیں)، قانع و مطمئن کرنے والی دلیل ہے، بلکہ معجزہ کو بُرھان کا نام دیا ہے۔ (۱)

پیغمبر کی ہدایت کا رُخ

معجزۂ ختمیہ اس لحاظ سے کہ کتاب ہے اور مقولہ قول و بیان وعلم و زبان سے ہے، ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ ہے، اس کتاب کا معجزہ ایسا ہے کہ جس کے اعجاز کے گوشے تدریجاً اور آہستہ آہستہ زیادہ روشن ہوتے جاتے ہیں، آج قرآن مجید کے بہت سے تعجب خیز امور ہمارے زمانہ کے لوگوں پر ظاہر و واضح ہوئے ہیں جو اس سے پہلے ظاہر نہیں تھے اور یہ بات کل ممکن بھی نہیں تھی، قرآن کریم کو علماء و دانش مند اشخاص عام لوگوں سے بہتر سمجھتے ہیں، اسی لحاظ سے معجزہ ختمیہ کتاب کی نوع سے قرار دیا گیا تاکہ یہ دور ختمیہ سے مناسبت رکھتا ہو، لیکن ....

کیا یہ معجزہ اس لحاظ سے کتاب کی نوع سے قرار دیا گیا کہ ضمناً انسان کو غیب سے شہود کی طرف، نامعقول سے عقلی و منطقی امور کی طرف، اور ماوراء طبیعت سے طبیعت کی طرف رہنمائی کرے؟ کیا محمدؐ کوشش کرتے ہیں کہ لوگوں کی تلاش و جستجو کا رُخ غیر عادی امور اور کرامات و خوارق

(۱) تفسیر المیزان زیر آیہ ۲۳ سورۂ بقرہ اور کتاب "وحی نبوّت" از آقائے محمد تقی شریعتی صفحہ ۲۱۴ ملاحظہ فرمائیں۔

عادات کی طرف سے عقلی و منطقی، علمی و طبیعی، اجتماعی اور اخلاقی امور کی طرف موڑ دیں؛ اور جستجو اور تلاش کے رخ کو "عجائب و غرائب" سے "واقعیات و حقائق" کی طرف پھیر دیں؟

معلوم نہیں ہوتا کہ یہ نظریہ صحیح ہو اور اگر یہ صحیح ہو تو ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ تمام انبیاء غیب کی طرف دعوت کرتے تھے اور محمدؐ شہود اور ظاہری چیزوں کی طرف دعوت کرتے تھے (لیکن، پھر قرآن کریم کی سیکڑوں آیتیں انھیں "عجائب و غرائب" کے ساتھ کیوں مختص کی گئی ہیں؟ بے شک قرآن کا ایک بنیادی امتیاز عالم شہادت و طبیعت کے (آیاتِ الٰہی ہونے کی حیثیت سے) مطالعہ کی دعوت دینا بھی ہے لیکن طبیعت کے مطالعہ کی دعوت اس معنی میں تو نہیں ہے کہ ذہنوں کو ہر غیر طبیعی امر کی طرف توجہ کرنے سے منصرف اور روگرداں ہو جانا چاہیے، بلکہ اس کے برعکس "آیات" اور "نشانیوں" کی حیثیت سے طبیعت کے مطالعہ کی دعوت دینا طبیعت سے ماوراء طبیعت کی طرف عبور کرنے کے معنی میں ہے۔ قرآن کی نظر میں غیب کا راستہ عالم شہود سے، ماوراء طبیعت کا راستہ طبیعت سے اور معقولات کا راستہ محسوسات سے گذرتا ہے۔

حضرت محمدؐ کے کام کی اہمیت اس میں ہے کہ جس طرح آپ طبیعت، تاریخ اور معاشرہ میں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں اور ان لوگوں کو جو غیر طبیعی امور کے سوا کسی بات کو تسلیم نہیں کرتے تھے عقل و منطق اور علم کے ذریعہ (دین کا) تابع و مطیع بناتے ہیں اسی طرح آپ کوشش کرتے ہیں کہ ان لوگوں کی قوتِ فکر و اندیشہ کو بھی جو عقل و منطق کا دم بھرتے ہیں اور عقلی و طبیعی اور محسوس چیزوں کے علاوہ کسی چیز کو نہیں مانتے۔ ایک برتر و بلند تر منطق سے آشنا کریں۔ اس دنیا و مافیہا کے متعلق جو نظریہ ، مذاہب بالخصوص اسلام پیش کرتا ہے اس کو ان نظریات کے مقابلہ میں جس کو انسانی علوم و خالص فلسفے پیش کرتے ہیں جو بنیادی امتیاز حاصل ہے وہ یہ ہے کہ بقول ولیم جیمس " مذہبی نظریات میں ایسے عناصر پائے جاتے ہیں جو مادّی عناصر کے علاوہ ہیں اور ایسے قوانین بھی وجود رکھتے ہیں جو انسانی معاشرہ کے جاننے پہچاننے قوانین کے علاوہ ہیں" قرآن یہ نہیں چاہتا کہ طبیعت

اور محسوسات کی طرف توجہ کو ماوراء طبیعت اور غیر محسوس امور کا جانشین بنا دے، قرآن کی اہمیّت اسی میں ہے کہ اس کے باوجود کہ کائناتی مطالعے کی طرف خاص توجہ ہے قرآن کے اپنے الفاظ میں "شہادت" "غیب پر ایمان لانے کو اپنی دعوت کا عنوان قرار دیتا ہے۔

"الٓمٓ ۔ ذالك الکتاب لا ریب فیه هدی للمتقین الذین یومنون بالغیب ......" (بقرہ ۲-۳)

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قرآن ان امور سے لوگوں کو منصرف کرنے کی فکر میں ہو جبکہ وہ خود بھی اسی مقولہ "عجائب و غرائب" یعنی معجزات سے ہے اس کے علاوہ اس نے ایک سَو آیتوں سے یادۂ اسی مقولہ (عجائب و غرائب) سے متعلق پیش کی ہیں؟ میری سمجھ میں اس جملہ کے معنی نہیں آتے کہ "کتابِ خدا وہ واحد و تنہا معجزہ ہے جس کا اعتقاد محض امورِ غیبی کے معتقدین پر منحصر نہیں ہے" کیا اور کیسا اعتقاد؟ کیا یہ اعتقاد کہ یہ ایک کتاب ہے اور بہترین مطالب پر حاوی ہے؟ یا یہ اعتقاد کہ یہ معجزہ ہے کسی چیز کے الٰہی دلیل و بیّنہ ہونے کے معنی میں معجزہ ہونے کا اعتقاد، غیب پر اعتقاد کے مساوی و مرادف ہے، کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص ایک ہی لمحہ میں غیب پر اعتقاد رکھتا بھی ہو اور اس اعتقاد سے عاری بھی ہو؟

یہ بھی کہا گیا ہے کہ محمدؐ کا معجزہ" امورِ غیر بشری" کے مقولہ سے نہیں ہے اگرچہ ایک عملِ غیر بشری ہے"، اس جملہ کے معنی بھی میرے لیے مبہم ہی ہیں اور اس کی تفسیر دو طرح سے کی جا سکتی ہے۔ ایک یہ کہ معجزۂ محمدؐ (قرآن) اس بنا پر کہ وحی ہے نہ کہ خود آنحضرتؐ کا قول، پس ایک غیر انسانی عمل ہے، لیکن عین اسی حالت میں کہ وہ قولِ بشر نہیں ہے بلکہ قولِ خدا ہے مقولۂ امورِ بشری سے (بھی) ہے اور ایک ایسا عادی کام ہے جو بشری کاموں کے مرادف ہے۔ میرے خیال میں یہ بعید معلوم ہوتا ہے کہ جملہ کا مطلب یہ ہو (جو بیان کیا گیا) کیونکہ اس صورت میں قرآن کو دوسری آسمانی کتابوں کے مقابلہ میں کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے، اس وجہ سے کہ وہ تمام کتابیں اس لحاظ سے کہ مبدءِ وحی سے صادر ہوئی ہیں، عملِ غیر بشری ہیں، لیکن اس لحاظ سے کہ کوئی خارق العادت گوشہ نہیں رکھتیں

امورِ غیر بشری کے مقولہ سے نہیں ہیں. جس طرح سے کہ ہم کچھ کلمات رکھتے ہیں جو" احادیث قدسیہ" کے نام سے مشہور ہیں اور عیناً وہ بھی کلامِ خدا ہیں جو وحی و الہام کیے گئے ہیں لیکن وہ معجزہ اور مقولۂ امورِ غیر بشری سے نہیں ہیں.

قرآن مجید کو تمام آسمانی کتابوں اور احادیثِ قدسیہ پر جو امتیاز حاصل ہے وہ اسی وجہ سے کہ وہ عمل غیر بشری بھی ہے یعنی وحی ہے اور مقولہ امور غیر بشری سے بھی ہے یعنی اعجاز و قدرت مافوق البشر کی حد میں ہے، اسی لیے قرآن کہتا ہے ؛ قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثل هذا القرآن لا یأتون بمثله ولو کان بعضهم لبعض ظهیرا" اے رسولؐ، کہہ دو اگر تمام جنّ وانس اس بات کے لیے جمع ہو جائیں کہ اس قرآن کا مثل بنا لائیں تو وہ اس کا مثل نہ لا سکیں گے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار و پشت پناہ بھی ہوں"(سورۂ اسراء ۸۸)

اس جملہ کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ" محمدؐ کا معجزہ- سابق تمام پیغمبروں کے معجزات. جیسے عصا کو اژدہا بنا دینا اور مردہ کو زندہ کر دینا جن کا مقولہ اور کام کا اندازِ بشر کے مقولہ اور اندازِ کام سے نہیں ہے. کے برخلاف (معجزۂ محمدیؐ) بشر کے کاموں کے مقولہ سے ہے کیونکہ یہ نوعِ کلام و بیان و علمِ زبان سے ہے. لیکن غیر بشری عمل ہے. یعنی بشری طاقت سے بلند حد میں ہے، ایک غیبی اور ماوراء الطبیعی قدرت و طاقت اس کا سرچشمہ ہے" اگر مقصود یہ ہو اور یہی ہونا بھی چاہیے، تو یہ خود غیب کا، ماوراء الطبیعت کا، خارق العادت کا، اور بالآخر ان تمام چیزوں کا اقرار و اعتراف ہے جنہیں" عجائب و غرائب" کہا جاتا ہے. پھر کیوں شروع سے ہم معجزہ اور خارق عادت امور کو جیسے خرافات و نامعقول امور سمجھیں، کیا یہ نہیں چاہیے کہ ہم ابتداہی سے معجزہ اور خارق عادت کے حساب کو خرافات و اوہام کے حساب سے جدا رکھیں تاکہ ناواقف اور کم علم افراد ان تعبیرات سے کچھ اور نہ سمجھیں جو ہمارا مقصد بھی نہیں ہے اور بنیادی طور پر کیوں مشہور الفاظ" پیغمبرؐ اسلام کی کتاب معجزہ ہے" کو بدل کر ہم یہ کہیں کہ" پیغمبرؐ کا معجزہ کتاب ہے": تاکہ نامناسب تعبیر اور تفسیر کرنے کی گنجائش پیدا ہو.

اسی دانشور محترم کا ایک مقالہ زیرِعنوان "قرآن اور کمپیوٹر" رسالۂ "فلق" میں جو تہران کے (کالج) دانشکدۂ ادبیات کے طلبہ کا نشریہ ہے۔ شائع ہوا تھا، جس کو مسئلہ اعجاز کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کی تصحیح اور ان کے غور و فکر کی تدریجی ترقی و تکامل کی علامت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اس مقالہ میں قرآن مجید کے الفاظ کو کمپیوٹر کی علامتوں سے بدلنے اور قرآن کی حقیقتوں کے کشف و اظہار کے لیے انسانی تمدّن و ترقی کے اس عظیم مظہر(کمپیوٹر) سے استفادہ کا ایک نقشہ پیش کیا گیا ہے جو درحقیقت بہت برمحل پیشکش ہے۔ پھر اس مقالہ میں ان خدمتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو بعض مصری دانش مندوں نے اس موضوع پر انجام دی ہیں اور بعض ایرانی مسلمان انجنیئر اور ریاضی داں جو اس کوشش میں ہیں یا جو کچھ انجام دے چکے ہیں — اس کے بعد "قرآن کا اعجاز کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے؟" کے عنوان سے اسی مقالہ میں ایک دلچسپ بحث کی ہے اور اسی کے ضمن میں ایک قیمتی کتاب "سیر تحوّل قرآن" کی طرف اشارہ کیا ہے جو ابھی تازہ ہی شائع ہوئی ہے اور اس کتاب کے عالی قدر مؤلف کے گرانقدر کشف و تحقیق کی تعریف کی ہے کہ "اس نے ثابت کیا ہے کہ آیتوں کی چھوٹائی بڑائی اور رسول اکرمؐ پر وحی شدہ کلمات میں روز بروز اضافہ نے ۲۳ سال کی مدّت میں ایک منظم اور خارقِ عادت منحنی قائم کی ہے۔"

پھر خود اس طرح اضافہ کرتے ہیں: "دنیا میں کون مقرر و سخنور ایسا ہے جس کی عبارت کی لمبائی سے ہر جملہ کی ادائگی کا سال معین کیا جا سکتا ہے؟ بالخصوص جبکہ یہ عبارت بھی ایسی کتاب کا متن نہ ہو جو ایک ادیب یا علمی شخصیت کا شاہکار ہو جو اس نے ایک معین وقت میں رشتۂ تحریر میں لایا ہو بلکہ یہ وہ کلام ہے جو ایک انسان کی زحمات اور تلاطم سے بھری ہوئی زندگی کے ۲۳ برسوں میں اس کی زبان پر جاری ہوا۔ خاص کر جب ایسی کتاب بھی نہ ہو جو کسی خاص موضوع یا معین و مشخص عنوان پر تألیف کی ہو بلکہ جس میں طرح طرح کے مسائل جو معاشرہ کی ضرورتوں کے مطابق اور ان سوالات، و حوادث و واقعات کے جوابات اور حل جو

ایک انقلاب کی طولانی زندگی میں پیش آتے ہیں ایک رہبر و رہنما کے ذریعہ سے تدریجاً بیان ہوئے اور پھر انہیں منظم طور پر جمع کیا گیا ہے"۔ (۱)

قرآن :

قرآن کریم ہماری آسمانی کتاب اور ہمارے پیغمبرؐ کا جاودانی معجزہ ہے یہ کتاب ۲۳ سال کی مدت میں تدریجاً ہمارے پیغمبرؐ پر نازل ہوئی

قرآن کریم جو پیغمبرؐ اکرم کی کتاب بھی ہے اور آپ کے اعجاز کا مظہر بھی، یہ کتاب عصاءِ موسیٰؑ اور دمِ عیسیٰؑ کے اثر سے صدہا گنا بزرگ و عظیم اثرات کی حامل ہے۔ پیغمبر اکرمؐ لوگوں کے سامنے آیاتِ قرآنی کی تلاوت فرماتے تھے اور ان آیات کی مخفی قوت جاذبہ لوگوں کو اسلام کی طرف کھینچ لیتی تھی۔ تاریخ اسلام میں اس موضوع سے متعلق واقعات کی تعداد شمار کی حد سے باہر ہے۔

قرآن مجید ۱۱۴ سوروں کا مجموعہ ہے اور یہ تمام سورے تقریباً ۶۲۰۵ آیتوں پر مشتمل ہیں اور ان تمام آیتوں میں تقریباً ۷۸ ہزار کلمے ہیں، مسلمانوں نے صدر الاسلام سے لے کر عصر حاضر تک قرآن کے بارے میں بے نظیر توجہ اور دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے جو قرآن کے ساتھ ان کی عقیدت کی دلیل ہے۔

قرآن مجید رسول اکرمؐ کے مبارک زمانہ ہی میں ایک جماعت کے ذریعہ جنہیں خود حضرتؐ ہی نے معین فرمایا تھا اور جو "کاتبانِ وحی" کے نام سے مشہور ہوئے۔ لکھا جاتا رہا، اس کے علاوہ اکثر مسلمان مرد اور عورتیں، چھوٹے اور بڑے پورا قرآن یا اس کی اکثر آیتوں کے زبانی یاد کرنے سے ایک عجیب عشق رکھتے تھے، قرآن مجید کو نمازوں میں بھی پڑھتے تھے اور نمازوں کے علاوہ بھی دوسرے اوقات و حالات میں اس کی تلاوت کو ثواب سمجھتے تھے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید کی تلاوت سے (روحانی) لذت حاصل کرتے تھے اور تلاوت قرآن ان کی روح کے آرام و سکون کا سرمایہ تھا۔

(۱) رسالہ "فلق" کتاب اول ص ۲۵

قرآن کے بارے میں مسلمانوں کی عظیم کوشش

مسلمانوں نے ہر زمانہ میں اپنی آسمانی کتاب سے شوق اور عشق کے زیرِاثر اپنے علمی وفکری امکانات کے مطابق قرآن مجید کے بارے میں کام کیے ہیں، جیسے اسے حفظ کرنا اور اپنے سینوں کے سپرد کر دینا، قرأت وتجوید کے استادوں اور ماہروں کی قرأت، معانی کی تفسیر، قرآنی لغات کی تشریح وتوضیح کے لیے مخصوص لغت کی کتابوں کی تصنیف وتالیف، تمام آیتوں، کلموں یہاں تک کہ مجموعۂ قرآن میں جتنے حروف ہیں ان کو بھی شمار کر لینا، یہ سب کام بڑی محنت کے ساتھ کیے گیے ہیں، قرآن کے معانی ومطالب کی باریک بینی کے ساتھ تحقیق اور حقوقی، اخلاقی، اجتماعی، فلسفی، عرفانی، علمی مسائل میں قرآن مجید سے استفادہ کرنا، اپنے اقوال اور تحریروں کو قرآنی آیات سے زینت دینا، قرآنی آیات کے نفیس کتبے، طغرے تیار کرنا، یا چونے کے اوپر آیتوں کا لکھنا، کاشی پر یا اور دوسری چیزوں پر قرآنی سوروں اور آیتوں کو خوشخط وخوش نما (خط نستعلیق، خط کوفی، خطِ ثلث اور دوسرے حسین طرز) خطوط وطرزِ تحریر میں لکھنا، سنہرے حروف میں قرآن نویسی، اپنے لڑکے اور لڑکیوں کو ہر علم سکھانے سے پہلے قرآن کی تعلیم دینا، قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے عربی زبان کے علم صرف ونحو کے قواعد کی ترتیب وتدوین اور (اس کی باریکیوں کو سمجھنے کے لیے، علم معانی وبیان وبدیع کی اختراع وایجاد، عربی زبان کی تمام لغات کو جمع کرنا وغیرہ وغیرہ۔

اعجاز قرآن : قرآن مجید حضرت خاتم الانبیاؐ کا جاودانی معجزہ ہے، مکّہ میں نازل ہونے کی ابتدا ہی سے جبکہ چھوٹے چھوٹے سوروں سے آغازِ نزول ہوا، رسول اکرمؐ نے آئینی طور پر اس کا مثل و مانند لانے کے لیے کفارِ مکّہ کو تحدّی (چیلنج) بھی کیا۔

یعنی آپ نے اس کا دعوٰے کیا کہ یہ قرآن میرا کلام نہیں ہے بلکہ خدا کا کلام ہے۔ میں یا کوئی اور بشر اس کی قدرت نہیں رکھتا کہ اس کا مثل لا سکے اور اگر تمہیں یقین نہ ہو تو اس کی آزمائش کر لو اور جس شخص سے تم چاہو مدد بھی لے سکتے ہو، لیکن یہ جان لو کہ اگر جن و انس ایک دوسرے کے پشت پناہ و مددگار بھی ہو جائیں کہ اس قرآن کا مثل لائیں تو بھی وہ اس پر قادر نہ ہونگے۔

پیغمبرؐ کے مخالفین نہ تو اس زمانہ میں اور نہ اس کے بعد سے آج تک جس کو چودہ صدیاں گذر گئیں (بلکہ اس سے بھی زیادہ زمانہ گذر گیا) اس چیلنج کا جواب نہیں دے سکے۔ اس زمانہ کے مخالف لوگوں کا آخری جواب یہ تھا کہ یہ تو جادو ہے۔ مخالفین کا خود یہ اتہام قرآن مجید کے خارق العادت ہونے کا اعتراف اور قرآن کے مقابلہ میں ان کی عاجزی کا ایک قسم کا اظہار ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کے دشمنوں نے جہاں تک ممکن تھا ان کو کمزور و مغلوب کرنے کے لیے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ البتّہ صرف ایک کام تھا جس پر انھوں نے کوئی اقدام نہیں کیا۔ کیوں کہ اس کام میں سو فیصدی نا امید تھے اور وہ وہی تھا کہ پیغمبرؐ بار بار بالاعلان چیلنج فرماتے تھے مگر ان کے پاس اس کا کوئی جواب ہی نہ تھا۔

خود قرآن مجید نے بھی اس امر (تحدّی) کی تصریح کی ہے یعنی قرآن کا مثل لانے کے سب نہیں تو کم سے کم ایک ہی سورہ چاہے صرف ایک سطر والے (قل ھو اللہ احد، یا انا اعطیناک الکوثر) قرآن کے سورہ کا مثل ہو۔

قرآن کے اعجازی گوشے !

قرآن کریم مختلف پہلوؤں سے معجزہ ہے یعنی بشری طاقت سے بلند ہے ہم یہاں مجملاً اور مختصر طور پر اشارہ کریں گے، قرآن مجید کا معجزہ ہونا کلّی اعتبار سے دو وجہوں سے ہے۔ لفظی اور معنوی۔ قرآن کا لفظی اعجاز متعلق حسن و زیبائی سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا معنوی اعجاز

مقولۂ علمی سے متعلق ہے۔ پس قرآن کا اعجاز ایک تو زیبائی و ہنری پہلو سے ہے اور دوسرے فکری وعلمی پہلو سے۔ ان دونوں پہلوؤں میں سے ہر ایک خصوصاً علمی پہلو کئی گوشوں کا حامل ہے۔(۱)

الفاظ قرآن : قرآن مجید کی بناوٹ و ترتیب نہ شعری ہے اور نہ نثری ۔ شعر اس وجہ سے نہیں ہے کہ اس میں وزن اور قافیہ نہیں ہے، اس کے علاوہ شعر عموماً ایک تخیل کے ماتحت جس کو تخیل شاعرانہ کہا جاتا ہے وجود میں آتا ہے، شعر کی بنیاد یا استواری و درستی مبالغہ و افراط پر ہوتی ہے جو ایک قسم کا جھوٹ ہے، قرآن میں نہ تو تخیلات شعری کا وجود ہے اور نہ خیالی تشبیہات کا — عین اسی حالت میں معروف نثر بھی نہیں ہے کیونکہ اسے جو روانی، لحن اور ایک (مخصوص اندازِ) موسیقی حاصل ہے وہ کسی نثری کلام میں آج تک دیکھنے اور سننے میں نہیں آئی۔ مسلمانوں نے ہمیشہ قرآن کریم کی تلاوت اس کے مخصوص انداز میں خوش الحانی کے ساتھ کی ہے اور کرتے ہیں۔

دینی دستور و قانون میں یہ حکم موجود ہے کہ قرآن کریم کو خوش الحانی سے پڑھا کرو۔ ائمہ اطہار علیہم السّلام کبھی کبھی اپنے گھروں میں ایسی دلربا و دلکش آواز میں تلاوت کرتے تھے کہ اُس گلی میں راستے چلنے والے ٹھہر جایا کرتے تھے، کوئی بھی نثری کلام قرآن کی طرح لحن قبول کرنے والا نہیں ہے وہ بھی مخصوص لحن اور مخصوص آوازیں جو روحانی عوالم سے مناسبت رکھتی ہیں (جن سے روح کو لذّت اور بالیدگی حاصل ہوتی ہے ۔ مترجم) نہ کہ ایسی آواز جو کہ لہو ولعب کے جلسوں اور اجتماعات سے متناسب ہو ریڈیو کی ایجاد و اختراع کے بعد کوئی بھی روحانی کلام روحانی

(۱) : ابھی تازہ ہی بعض مصری وایرانی علماء و دانشمندوں نے قرآن مجید کے "فنی پہلو سے بھی معجزہ ہونے کا دعوٰے کیا ہے، یعنی "حروف وکلمات کے ہندسہ (اعداد وشمار) کا ایک مخصوص نظام اور آیات کی سطح نازلہ کے تدریجاً بلند ہونے کا ایک مخصوص راستہ"۔ ملاحظہ ہو کتاب "سیر تحوّل قرآن" اور مقالہ "قرآن اور کمپیوٹر" رسالہ "فلق" شمارہ اوّل (نشریہ دانشجویان دانشکدۂ ادبیات تہران) ۔

آوازوں کے متحمل ہونے اور دلکشی و دلربائی کے لحاظ سے قرآن کی برابری نہیں کرسکا۔ اسلامی ملکوں کے علاوہ دوسرے غیر اسلامی ممالک نے بھی دلکشی اور آوازہی کے پیشِ نظر اپنے اپنے ریڈیو کے پروگراموں میں قرآن کریم کی تلاوت کو جگہ دی۔

عجیب بات یہ ہے کہ قرآن کریم کا حسنِ صوت اور اس کی زیبائی و دلکشی نے زمان و مکان کے پردوں کو لپیٹ کر پیچھے پھینک دیا ہے، بہت سی باتیں اور بہتیرے کلام کی دلکشی کسی وقت و زمانہ کے ساتھ مخصوص ہے، جو دوسرے زمانہ کے ذوق سے قطعاً میل نہیں کھاتی یا وہ کلام کم از کم ایک قوم و ملت کے مذاق کے مطابق ہوتا ہے جو مثلاً کسی مخصوص زبان سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ لیکن قرآن کی زیبائی و دلکشی نہ تو کسی زمانہ سے مخصوص ہے اور نہ کسی جگہ، قوم و نسل اور زبان والوں سے۔ وہ تمام لوگ جو قرآن کے مفاہیم اور زبان سے آشنا ہو گئے ہیں انھوں نے اس کو اپنے ذوق کے مطابق پایا ہے۔ جتنا بھی زمانہ گذرتا جاتا ہے اور جسقدر مختلف ملتیں قرآن سے واقفیت حاصل کرتی جاتی ہیں اتنی ہی قرآن کی خوبیوں سے متاثر اور اس کی زیبائی و دلکشی پر فریفتہ ہوتی جاتی ہے۔

متعصب یہودیوں اور عیسائیوں اور چند دوسرے مذاہب کے ماننے والوں نے ان اسلامی چودہ صدیوں کی طویل مدت کے دوران قرآن کی عظمت و منزلت کو گھٹانے اور کمزور کرنے کے لیے طرح طرح کے مقابلے کیے ہیں اور قسم قسم کے ہتھکنڈے آزمائے ہیں، کبھی قرآن میں تحریف ہونے کا پروپیگنڈا کیا، کبھی قرآن میں بیان شدہ بہت سے قصوں کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی اور کبھی دوسرے مختلف طریقوں سے قرآن کے خلاف کام کیے لیکن کبھی انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ اپنے منتخب مقرروں اور ادیبوں سے مدد حاصل کر کے قرآن مجید کی مبارزہ طلبی (چیلنج) کا جواب دیں اور قرآن کے مثل کم از کم ایک چھوٹا سا ہی سورہ بنا لائیں اور دنیا والوں کے سامنے پیش کر دیں۔ اسی طرح تاریخ اسلام میں بھی بہت سے ایسے افراد پیدا ہوئے ہیں جو اصطلاح میں "زنادقہ" یا "ملاحدہ" کے نام سے پکارے جاتے ہیں اور ان میں سے چند افراد تو فوق العادہ

صلاحیت اور شہرت کے مالک تھے اس گروہ نے بھی مختلف ڈھنگ اور مختلف طریقوں سے "دین" کے خلاف، عام طور پر اور قرآن کے خلاف خصوصی طور پر بہت سی باتیں کہی ہیں، ان میں سے کئی افراد تو عربی زبان کے خداوندِ سخن شمار کیے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ لوگ بھی قرآن کے ساتھ نزاع و مخاصمت پر اتر آتے ہیں، لیکن ان سب طریقوں سے جو اکیلا نتیجہ نکلا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کی عظمت کو روشن تر اور اس کے مقابلہ میں اپنے کو حقیر تر ظاہر کر دیا ہے۔ تاریخ نے اس موقعہ پر ابن راوندی، ابوالعلاء معرّی اور عرب کے نامدار شاعر ابوالطیب متنبّی کے متعلق بہت سی کہانیاں اس بارے میں ثبت کی ہیں، یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اس بات کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ قرآن کو ایک "بشری کام" ثابت کریں۔

بہت سے افراد نبوّت کا دعوےٰ کر کے اٹھے اور انھوں نے کچھ ایسے کلام پیش کیے جو ان کے خیال میں قرآن کے مشابہ تھے اور ان لوگوں نے یہ دعوےٰ کیا کہ ان کے یہ کلام بھی قرآن کے مانند ہیں اور خدا کی طرف سے ہیں۔ "طُلَیحہ" اور "مُسیلمہ" اور "سجّاح" اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، اس گروہ نے بھی بالآخر دوسری طرح سے اپنی عاجزی اور قرآن مجید کی عظمت کو واضح و روشن کیا۔

عجیب بات یہ ہے کہ خود پیغمبرؐ کا کلام جن کی زبان مقدّس پر قرآن جاری ہوا، قرآن سے مختلف ہے، پیغمبرؐ خدا کے بہت سے کلمات خطبوں، دعا، مختصر جملوں اور حدیث کی شکلوں میں موجود ہیں اور فصاحت کی انتہائی بلندی پر ہیں مگر کسی طرح سے بھی قرآن کا رنگ و بو اس کے اندر موجود نہیں ہے یہ خود اس امر کی دلیلِ واضح ہے کہ قرآن اور پیغمبرؐ کے کلام کے سرچشمے الگ الگ ہیں، قرآن کا منبع اور ہے اور احادیث کا منبع دوسرا ہے۔ حضرت علی علیہ السّلام تقریباً اپنی دس سال کی عمر سے قرآن سے آشنا ہیں یعنی علیؑ کا سنّ مبارک مذکورہ حدود میں تھا کہ قرآن کی ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں اور علیؑ اس پیاسے کی طرح جو شیریں پانی تک پہنچ جائے ان آیتوں کو حفظ فرما لیتے تھے اور پیغمبرؐ اکرم کی آخر عمر مبارک تک علیؑ کا نام نامی کاتبانِ وحی میں سرفہرست تھا، علی حافظِ قرآن تھے اور ہمیشہ قرآن کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔

راتوں کو جب عبادت کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو آیاتِ قرآن کی تلاوت سے خوش رہتے تھے باوجود اس وصف کے۔ اگر قرآن کی بناوٹ اور ترتیب اور اس کا انداز تقلید کے قابل ہوتا تو علیؑ کو اس بے نظیر استعداد کے ذریعہ جو آپؑ کو فصاحت و بلاغت وخطابت میں حاصل تھی کہ قرآن کے بعد آپ کے کلام کی کوئی مثال ونظیر نہیں مل سکتی، چاہیے تھا کہ قرآن کے اندازِ بیان کے زیر اثر ہونے کی بنا پر قرآن ہی کے طرز و انداز کی پیروی کرتے اور آپ کے تمام خطبے اور تمام تقریریں خود بخود آیاتِ قرآنی کی شکل میں ڈھل جاتیں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کا انداز علیؑ کے کلام کے انداز سے بالکلیہ جداگانہ و مختلف ہے۔ علیؑ اپنے روشن، فصیح و بلیغ خطبوں کے ضمن میں جب کبھی کوئی آیت قرانی پیش کرتے تو وہ آپ کے کلام سے بالکل اور کامل طور پر علیحدہ محسوس ہوتی، جیسے کہ کوئی بڑا ستارہ جو دوسرے ستاروں کے مقابل فوق العادہ چمک دمک رکھتا ہے اور ایک امتیازی شان کا حامل ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے ایسے موضوعات کو پیش نہیں کیا ہے جو عموماً تقریر و خطابت میں انسان کی ہنرنمائی کا ذریعہ ہوتے ہیں اور افرادِ بشر اگر چاہیں کہ اپنی خطابت وسخنوری کے ہنر کو نمایاں کریں تو اس ذریعہ کا انتخاب کرتے ہیں اور اپنی باتوں، تقریروں میں اس کے ذریعہ خوبصورتی اور جاذبیت پیدا کرتے ہیں از قبیل فخر، مدح، ہجو (کسی کی مذمت کرنا)، مرثیہ، غزل اور طبیعی حسن وجمال کی تعریف و توصیف وغیرہ۔

قرآن نے نہ تو ان موضوعات کو پیش کیا ہے اور نہ ان موضوعات کے بارے میں دادِ سخن ہی دی ہے۔ قرآن نے جن موضوعات کو پیش کیا ہے وہ سب کے سب معنوی ہیں، توحید ہے، معاد ہے، نبوت ہے، اخلاق ہے، احکام ہیں، مواعظ ونصائح ہیں، قصے ہیں اور ان سب حالات کے باوجود وہ دلکشی وزیبائی کی اعلیٰ منزل پر پہنچا ہوا ہے۔

قرآن کریم میں کلمات کی ترتیب وتنظیم بے نظیر و بے عدیل ہے، آجتک کوئی شخص بغیر اس کے کہ قرآن مجید کی زیبائی وحسن پر دھبہ ڈالے قرآن کے کسی ایک کلمہ کو بھی ادھر سے اُدھر یا ادھر سے ادھر نہیں کرسکا ہے اور نہ آج تک کوئی شخص قرآن کے مانند بنا کر لا سکا۔ قرآن اس لحاظ سے ایک حسین

وخوشنما عمارت کے مانند ہے کہ نہ تو کوئی شخص اس میں تغیر و تبدیل کرکے اور اس کے اجزاء مثلاً (ستونوں، دریچوں وغیرہ) کو ادھر سے ادھر کرکے اس کی زیبائی وخوش نمائی میں کوئی اضافہ کرسکتا ہے اور نہ اس سے بہتر یا اس کے مانند بنا سکتا ہے، قرآن مجید کی بناوٹ اور اس کا اسلوب بیان بالکل نرالا ہے نہ تو اس کے پہلے اس کی کوئی مثال ملتی ہے اور نہ اس کے بعد ملتی ہے اور نہ ملے گی یعنی نہ تو اس سے پہلے کسی نے اس اسلوب میں کوئی بات کہی اور نہ اس کے بعد کوئی شخص اس کا مثل لاسکا یا اس اسلوب کی تقلید کرسکا۔

قرآن کی تحدّی اور مبارزہ طلبی (چیلنج) آج بھی اسی طرح پہاڑ کی طرح قائم اور اٹل ہے اور ہمیشہ اٹل رہیگا۔ آج بھی تمام ایماندار مسلمان دنیا کے تمام لوگوں کو دعوت دیتے ہیں کہ اس مقابلہ میں شرکت کریں اور اگر آج بھی قرآن مجید کا مثل و مانند پیدا ہو جائے گا تو تمام مسلمان اپنے دعوے اور ایمان سے دستبردار ہو جائیں گے۔ لیکن انھیں کامل اطمینان حاصل ہے ایسی بات کبھی ممکن ہی نہیں ہے۔

معانی قرآن : قرآن کا اعجاز معانی و مطالب کے لحاظ سے تفصیلی بحث کا خواستگار ہے اور کم از کم ایک کتاب کا محتاج ہے، لیکن ممکن ہے کہ بطور اختصار اس گوشہ پر روشنی ڈالی جائے — تمہید کے طور پر پہلے ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ قرآن کس فن کی کتاب ہے؟ کیا یہ کتاب فلسفہ کی کتاب ہے؟ کیا یہ کتاب علمی یا ادبی یا تاریخی کتاب ہے؟ یا یہ صرف ایک ہنری نشان واثر ہے؟ جواب یہ ہے کہ قرآن ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں ہے جس طرح سے کہ پیغمبر اکرمؐ بلکہ تمام انبیاء و مرسلین بالکل ایک جداگانہ حیثیت کے مالک ہیں۔ نہ تو وہ فلسفی ہیں اور نہ منطقی، نہ ادیب ہیں اور نہ مؤرخ اور نہ ہنرمند یا صنعت گر ہیں اور عین اس حالت میں کہ ان میں سے نہیں ہیں پھر بھی ان سب خصوصیات کے علاوہ مزید صفات کے مالک ہیں، اسی طرح قرآن بھی جو آسمانی کتاب ہے، نہ فلسفہ ہے نہ منطق نہ تاریخ ہے اور نہ ادبیات اور

ہنری نمونہ ؟ سب کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی ان سب خصوصیات کے علاوہ مزید خصوصیات کا حامل ہے۔ قرآن انسانوں کی رہنمائی کی کتاب ہے اورحقیقت میں وہ" انسان" کی کتاب ہے لیکن انسان؟ کونسا انسان ؟ ایسا انسان جس کو انسان کے خدانے پیدا کیا اور خدا کے پیغمبر اس لیے آئے کہ اسے خود اپنے کو پہچنوایئں (کہ وہ کیا ہے) اوراس کی سعادت و نیک بختی کا راستہ اس کے سامنے کھول دیں اور قرآن چونکہ انسان کی کتاب ہے پس" خدا" کی کتاب بھی ہے کیونکہ انسان ہی وہ موجود ہے جس کی خلقت اس دنیا سے پہلے سے ہے اورجس کا وجود اس دنیا کے مابعد تک جاکر ختم ہوتا ہے۔ یعنی انسان بنظر قرآن الٰہی روح کا ایک نفخہ (دَم یا پھونک) ہے اور خواہ نخواہ بہرحال اپنے رب کی طرف پلٹ کے جائے گا، یہی وجہ ہے کہ خدا کی معرفت اور انسان کی خود شناسی ایک دوسرے سے جدا نہیں۔

انسان جب تک اپنے کو نہ پہچانے گا، اپنے خدا کو بھی صحیح طریقے سے نہیں پہچان سکتا، دوسرے لحاظ سے، انسان فقط خدا شناسی کے ساتھ ہی اپنی حقیقت واقعیہ کو پہچان سکتا ہے۔ انسان پیغمبروں کے مکتبِ فکر میں جس کا مکمل ترین نمونہ قرآن ہے، اس انسان کے مقابلہ میں جس کو بشر علم و منطق کے ذریعہ سے پہچانتا ہے بہت مختلف ہے یعنی وہ (پہلا) انسان بہت وسیع معنی رکھتا ہے، جبکہ یہ انسان جس کو بشر علوم کے ذریعہ سے پہچانتا ہے دو بریکٹوں (پیدائش — موت) کے درمیان مستقر ہے، ان دو بریکٹوں سے قبل اور بعد بالکل تاریکی چھائی ہوئی ہے اور بشری علوم کی نظر میں یہ چیزیں نامعلوم ہیں۔

لیکن قرآن کا انسان ان دو بریکٹوں کے درمیان محدود نہیں ہے، بلکہ وہ دوسری دنیا سے آیا ہے اور دنیا کے مدرسے میں۔ اسے چاہیے کہ اپنے کو مکمل کرے اور اس کا مستقبل دوسری دنیا میں الٰہی امر سے وابستہ ہے کہ اس دنیا کے مدرسہ میں کس قسم کی کارکردگی اور تلاش یا کاہلی و سستی انجام دی ہے۔ اس کے علاوہ تولد اور موت کے درمیان انسان جس کو بشر پہچانتا ہے بہت سطحی و

معمولی ہے بہ نسبت اس انسان کے جسے پیغمبروں نے پہچنوایا ہے قرآن کے انسان کو چاہیے کہ ان باتوں کا علم حاصل کرے :

(۱) وہ کہاں سے آیا ہے ؟ (۲) کہاں جائے گا ؟ (۳) وہ کہاں ہے ؟ (۴) اسے کیا ہونا چاہیئے اور (۵) اسے کیا کرنا چاہیے ؟۔

قرآن کا انسان جس وقت ان پانچوں سوالوں کا عملاً صحیح جواب دے گا تو اس دنیا میں جس میں وہ ہے اور اس دنیا میں جہاں وہ جائیگا (دونوں جگہوں میں) اس کی سعادت و نیک بختی کی ضمانت ہو جاتی ہے۔ اس انسان کو یہ جاننے کے لیے کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کس سرچشمہ سے اس کا آغاز ہوا ہے چاہیے کہ اپنے خدا کو پہچانے اور اپنے خدا کو پہچاننے کی غرض سے دنیا اور انسانوں کے بارے میں آفاقی اور انفسی نشانیوں کی حیثیت سے مطالعہ اور غور و فکر کرے اور وجود و ہستی کی گہرائیوں میں بنظر غائر مطالعہ کرے۔ اور یہ جاننے کے واسطے کہ کہاں جائے گا ؟ ان چیزوں کے بارے میں جنھیں قرآن خدا کی طرف واپسی کہتا ہے یعنی قیامت، حشر ونشر، قیامت کے خطرات، ہمیشہ قائم رہنے والی نعمتیں اور سخت عذاب اور اس کا کچھ لوگوں کے لیے جاودانی ہونا مختصر یہ کہ بعد از موت جو منازل و مراحل پیش آنے والے ہیں ان پر تامل و فکر کرے اور ان سے آگاہی حاصل کرے اور سب کا اعتقاد رکھے اور ان پر ایمان لائے اور خدا کو جس طرح اوّل اور موجودات کا نقطۂ آغاز جانتا ہے اسی طرح آخر اور تمام موجودات کی بازگشت و واپسی کا نقطہ بھی جانے۔

اور یہ جاننے کے لیے کہ وہ کہاں ہے ؟ چاہیے کہ دنیا کے نظاموں اور طور طریقوں کو پہچانے اور تمام موجودات کے درمیان انسان کے مقام و منزلت کو سمجھنے کی کوشش کرے اور موجودات کے درمیان اپنی حقیقت کو (پھر سے) پالے۔ اور یہ جاننے کے لیے کہ اسے کیا ہونا چاہیے ؟ چاہیے کہ انسانی خصلتوں اور عادتوں کو پہچانے اور اپنے کو انہی اخلاق و خصائل کی بنیاد پر قائم و استوار کرے اور انہی کے مطابق اپنے کو ڈھالے۔ یہ جاننے کے لیے کہ اسے کیا کرنا چاہیے ؟ فردی اور

اجتماعی مقررہ امور و احکام کی پیروی کرے۔

ان مذکورہ تمام باتوں کے علاوہ قرآن کے انسان کو چاہیے کہ غیر محسوس اور دکھائی نہ دینے والے موجودات اور خود اسی قرآن کے الفاظ میں "غیب" پر ان کے ارادۂ الٰہی کے مظہر و مجلا ہونے کی حیثیت سے ایمان لائے اور نیز یہ جاننا چاہیے کہ خداوند متعال نے کسی زمانہ اور کسی وقت میں بھی بشر کو جو آسمانی ہدایت کا ہمیشہ محتاج رہا ہے۔ مہمل اور بغیر ہادی کے نہیں چھوڑا ہے اور ہمیشہ خدا کے منتخب و برگزیدہ افراد کا طبقہ جو خدا کے پیغمبر اور خلق کے رہنما رہے ہیں۔ خداوند عالم کی طرف سے مبعوث ہوتے اور الٰہی پیغام کو بندوں تک پہنچاتے رہے ہیں۔

قرآن کا انسان طبیعت (کائنات عالم) پر ایک "آیت" و نشانی کی حیثیت سے اور دنیا کی تاریخ پر ایک واقعی "آزمائشگاہ" و امتحان گاہ کے عنوان سے۔ جو پیغمبروں کے تعلیمات کے صحیح ہونے کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ نگاہ ڈالتا ہے۔ ہاں! قرآن کا انسان ایسا ہی ہے اور جو مسائل قرآن میں انسان کے واسطے بیان کئے گئے ہیں وہ علاوہ دوسرے چند مسائل کے یہی ہیں۔

قرآنی موضوعات ؛

قرآن کریم میں جو موضوعات پیش کیے گئے ہیں وہ بہت زیادہ ہیں اور انھیں جزئی طور پر شمار نہیں کیا جا سکتا۔

پھر بھی مندرجہ ذیل مسائل پر ایک اجمالی نظر ڈالی جاتی ہے۔

(۱) خدا اور اس کی ذات، صفات اور یکتائی اور وہ چیزیں جن سے ہمیں خدا کو پاک و منزہ سمجھنا چاہیے اور وہ باتیں جن سے ہمیں خدا کو متصف جاننا چاہیے (صفات سلبیہ اور صفات ثبوتیہ)

(۲) قیامت، محشر، تمام اموات کو زندہ کر کے اٹھانا اور موت سے لے کر قیامت تک کے درمیانی مرحلے (برزخ)

(۳) ملائکہ، فیض رسانی کے ذرائع، وہ غیر مرئی قوتیں جو خود آگاہ بھی ہیں اور خدا آگاہ بھی، خدا

کے احکام جاری کرنے والے۔

(۴) انبیاء و مرسلین، یا وہ انسان جو الٰہی وحی اپنے قلوب کے ذریعہ حاصل کرتے اور اسے دوسرے انسانوں تک پہنچاتے ہیں۔

(۵) خدا پر ایمان لانے اور قیامت، ملائکہ اور پیغمبروں اور آسمانی کتابوں پر ایمان لانے کے لئے رغبت اور شوق دلانا۔

(۶) آسمانوں، زمینوں، پہاڑوں، سمندروں، سبزوں، درختوں، حیوانات، بادل، ہوا، بارش، برف اور اولے اور ٹوٹنے والے ستارے وغیرہ کی خلقت (اور ان پر غور و فکر)

(۷) خدائے واحد و یکتا کی عبادت اور اس میں خلوصِ نیت پیدا کرنے، کسی شخص یا کسی چیز کو عبادت میں خدا کا شریک قرار نہ دینے کی طرف دعوت اور غیر خدا چاہے وہ کوئی انسان ہو یا فرشتے یا سورج ہو یا ستارے اور درخت یا بت کی عبادت و پرستش کی سخت و شدید ممانعت۔

(۸) اس دنیا میں خداوند عالم کی نعمتوں کو یاد دلانا۔

(۹) نیکوکاروں اور اعمالِ صالحہ بجا لانے والوں کے لیے اس دنیا کی ہمیشہ باقی رہنے والی نعمتیں اور بدکاروں اور سرکشوں کے لیے اس دنیا کا سخت عذاب اور کچھ لوگوں کے لیے ہمیشہ باقی رہنے والا (عذاب)

(۱۰) خدا کے وجود اور وحدانیت، قیامت اور پیغمبروں کے بارے میں دلیلوں اور حجتوں کا بیان اور ان بیانات کے ضمن میں کچھ غیبی خبروں کا ذکر۔

(۱۱) تاریخ اور قصّے ایک انسانی آزمائشگاہ ہونے کی حیثیت سے ایسی لیبورٹری (آزمائشگاہ) جو پیغمبروں کی دعوت کی سچائی کو روشن کرتی ہے اور انبیاء کی سیرت پر عمل کرنے والوں کا انجام بخیر ہونا اور انبیاء کی تکذیب کرنے والوں کا انجام بد۔

(۱۲) تقوٰی، پرہیزگاری اور نفس کی صفائی و پاکیزگی۔

(۱۳) نفس امارہ اور نفسانی خواہشات اور شیطانی وسوسوں کے خطرات کی طرف متوجہ رہنا۔

(۱۴) انفرادی اچھے اخلاق از قبیل شجاعت، استقلال و پائداری، صبر، عدالت، احسان، محبت، ذکرِ خدا، خدا سے محبت، شکرِ خدا، خدا سے ڈرتے رہنا، خدا پر بھروسہ، خدا کی خوشی پر راضی رہنا اور فرمانِ خدا کے سامنے سر جھکا دینا، عقل سے کام لینا، سوچنا اور غور و فکر کرنا، علم و معرفت تقوٰے کے ذریعہ دل میں نورانیت پیدا کرنا، سچائی اور امانت وغیرہ۔

(۱۵) اجتماعی اخلاق جیسے اتحاد و یک جہتی و ہم آہنگی، آپس میں ایک دوسرے کو حق اور صبر کی وصیّت کرتے رہنا، نیکی اور تقوٰے کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا، بغض و حسد کو دل سے نکال پھینکنا، اچھے کاموں کا حکم دینا اور برائیوں سے منع کرنا، راہِ خدا میں جان و مال کے ذریعہ جہاد کرنا وغیرہ۔

(۱۶) احکام جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، خمس، حج، جہاد، نذر، قسم، تجارت، رہن، اجارہ ہبہ، نکاح، زن و شو کے حقوق، والدین اور اولاد کے حقوق، طلاق، لعان، اظہار، وصیّت، میراث، قصاص، حدود و تعزیرات، قرض، قضاوت، گواہی، حلف (قسم) مالداری، مالکیّت، حکومت، شوریٰ، فقراء کا حق، معاشرہ کا حق وغیرہ وغیرہ۔

(۱۷) رسول اکرمؐ کے ۲۳ سالہ دورِ بعثت کے حادثات و واقعات۔

(۱۸) رسول اکرمؐ کے احوال و خصوصیّات، آپ کے صفات حمیدہ، آنحضرتؐ کے بارے میں عتاب۔

(۱۹) ہر زمانہ کے تین گروہوں مومنین، کافرین اور منافقین کے عام صفات کا بیان۔

(۲۰) دورِ بعثت پیغمبرؐ کے مومنین، کافرین اور منافقین کے اوصاف کا ذکر۔

(۲۱) فرشتوں کے علاوہ دوسری دکھائی نہ دینے والی مخلوقات، جنّات اور شیطان وغیرہ۔

(۲۲) تمام موجوداتِ عالم کا خدا کی حمد و تسبیح کرنا اور تمام موجودات کے اندر اپنے خالق و پروردگار

کے بارے میں ایک قسم کی آگاہی کا ہونا۔

(۲۳) خود قرآن کی توصیف (تقریباً پچاس اوصاف کا ذکر)۔

(۲۴) دنیا اور دنیا کے طور طریقے۔ دنیاوی زندگی کی ناپائداری اور اس کا اس قابل نہ ہونا کہ انسان کا آئیڈیل اور اس کی کامل آرزو قرار پائے اور یہ کہ خدا اور آخرت یعنی ہمیشہ باقی رہنے والی دنیا ہی اس قابل ہے کہ انسان کا انتہائی مقصود و مطلوب قرار پائے۔

(۲۵) انبیاء کرام کے معجزات وخوارق عادات۔

(۲۶) گذشتہ آسمانی کتابوں کی تائید وتصدیق، خصوصاً تورایت وانجیل کی اور ان دونوں کتابوں میں کی جانے والی تحریفوں اور غلطیوں کی تصحیح۔

معانیٔ قرآن کی وسعت !

اوپر جو باتیں بیان کی گئیں وہ قرآن مجید میں بیان شدہ موضوعات کی ایک اجمالی فہرست ہے پھر بھی یہ دعوٰی نہیں کیا جا سکتا کہ اختصار کے لحاظ سے بھی یہ کافی ہے۔ اگر انہیں گوناگوں موضوعات کو جو انسان، خدا، دنیا اور انسان کے فرائض کے بارے میں ہیں پیش نظر رکھ کر ہر اس بشری کتاب سے جو انسان کے بارے میں لکھی گئی ہے اس کا موازنہ کریں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ کوئی کتاب بھی قرآن سے موازنہ کی منزل میں نہیں آسکتی اور نہ موازنہ کا طرف ثانی بن سکتی ہے۔ بالخصوص اس نکتے کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ قرآن ایک ایسے شخص کے ذریعہ ووسیلے سے نازل ہوا ہے جو "امی" اور ان پڑھ تھے (یعنی دنیا میں کسی شخص سے کوئی سبق نہیں پڑھا۔ مترجم) اور کسی عالم و دانشمند کے افکار سے واقف وآشنا نہیں تھے اور مزید برآں بطور اخص اگر ہم اس امر پر غور کریں کہ ایسے شخص کا ظہور ایسے محیط وماحول میں ہوا تھا جو تمام بشری ماحولوں سے زیادہ جاہل ماحول تھا اور اس ماحول کے لوگ عموماً تمدن اور علم سے بے گانۂ محض تھے۔

قرآن نے بہت وسیع معانی ومطالب بیان کیے ہیں اور انھیں اس طرح پیش کیا ہے کہ بعد میں خود قرآن الہام کا منبع وسرچشمہ بن گیا، فلاسفہ کے لیے بھی اور علماء حقوق وفقہ واخلاق وتاریخ وغیرہ کے لیے بھی۔

یہ امر ناممکن بلکہ محال ہے کہ کوئی فرد بشر خواہ وہ کتنا ہی بڑا فلسفی ودانشمند ہو، اپنی طرف سے ان سب معانی ومطالب کو ایسی معیاری سطح پر جو دنیا کے بڑے بڑے علماء اور دانشوروں کے افکار کو اپنی طرف کھینچ لے۔ بیان کر سکے۔ یہ تو اس صورت میں ہے جب کہ ہم قرآن میں بیان شدہ مطالب کو علماء بشر کے بیان کردہ مطالب کی سطح کے برابر فرض کریں، لیکن عمدہ ونفیس بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے ان اکثر مسائل میں نئے نئے افق پیدا کر دئے ہیں۔

خدا قرآن میں: یہاں ہم مذکورہ بالا موضوعات میں سے صرف ایک موضوع کی طرف اشارہ کریں گے اور وہ موضوع ہے۔ خدا اور جہان وانسان سے اس کا رابطہ وتعلق۔ ہم اگر محض اسی ایک موضوع کے بیان کرنے کی کیفیّت کا جائزہ لیں اور اس کا موازنہ ومقایسۂ انسانی افکار سے کریں تو قرآن کا فوق العادہ اور معجزہ ہونا ظاہر وروشن ہو جائیگا۔

قرآن نے خدا کے صفات بیان کیے ہیں اور اپنی اس توصیف میں ایک طرف تو اسے پاک ومنزّہ قرار دیا ہے یعنی اس سے ایسے صفات کی نفی کی ہے جو اس کے شایان شان نہیں ہیں اور اس کو ان صفات سے پاک ومنزّہ جانا ہے اور دوسری طرف صفاتِ کمال اور اسماء حسنٰی کو ذاتِ خدا کے لیے ثابت کیا ہے۔ تقریباً ۱۵ آیتوں میں خداوند عالم کی تنزیہ بیان ہوئی ہیں اور تقریباً پچاس (۵۰) آیتوں سے زیادہ ایسی ہیں جو صفاتِ کمال اور اسماءٔ حسنیٰ سے خداوند عالم کے متصف ہونے کے بارے میں ہیں۔ قرآن مجید اپنی ان توصیفوں میں ایسا باریک بین نظر آتا ہے جس نے

زیادہ سے زیادہ عمیق فکرو نظر رکھنے والے علماءِ الٰہی کو محوِ حیرت کر دیا ہے اور یہ خود ایک اُمّی اور ان پڑھ شخص کا روشن ترین معجزہ ہے۔ قرآن نے معرفت و خدا شناسی کی راہیں دکھانے کے لیے تمام موجودہ راہوں سے فائدہ حاصل کیا ہے۔ آفاقی اور انفسی نشانیوں کے مطالعہ کا راستہ، نفس کے تزکیہ اور اس کی صفائی کا راستہ، بطورِ کلی وجود و ہستی کے بارے میں گہرائی کے ساتھ غور و فکر کا راستہ قابل و فاضل ترین فیلسوفانِ اسلامی نے اپنی محکم و مضبوط ترین دلیلوں کو اپنے اقرار و اعتراف کے ساتھ قرآن مجید ہی سے بطورِ الہام حاصل کیا ہے۔

قرآن نے دنیا اور مخلوقات کے ساتھ خدا کے رابطہ کو توحید محض پر قرار دیا ہے یعنی خداوند متعال اپنی فعّالیت اور اپنے ارادہ و مشیّت کو نافذ کرنے میں اپنا کوئی مقابل و معارض نہیں رکھتا، اس کے تمام افعال اور ارادے اور سارے اختیارات اسی کے حکم اور اسی کے قضاؤ قدر کے تحت ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

انسان کا خُدا سے رشتہ و تعلق!

قرآن کریم نے خدا کے ساتھ انسان کے رشتہ اور تعلق کو دلکش ترین اندازِ بیان میں بیان کیا ہے، قرآن کا خدا۔ فلسفیوں کے خدا کے برخلاف۔ ایک خشک و بے روح اور بشر سے یکسر بیگانہ موجود نہیں ہے، قرآن کا خدا انسان کی رگِ گردن سے بھی زیادہ اس سے نزدیک ہے، انسان کے ساتھ لین دین کا معاملہ رکھتا ہے اور اس کے مقابل میں انسان کو رضا و خوشنودی عطا کرتا ہے، اس کو اپنی طرف جذب کرتا ہے (کھینچتا ہے) اور اس کے دل کے آرام و سکون و اطمینان کا سرمایہ ہے۔ " الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب" (۱) انسان خدا سے اُنسیت اور الفت و محبت رکھتا ہے بلکہ تمام موجودات اس کو چاہتے ہیں اور اسی کو پکارتے ہیں، تمام موجوداتِ عالم اپنے اپنے وجود کی گہرائیوں سے اس کے ساتھ

(۱) سورۂ رعد - ۲۸

رازدارانہ رابطہ وتعلق رکھتے ہیں ، اس کی حمد کرتے ہیں اور اس کی تسبیح کرتے ہیں " ان من شئ الا یسبح بحمدہ ولکن لا تفقھون تسبیحھم " (۱) فلسفیوں کا خدا جس کو وہ لوگ صرف محرّک اوّل اور واجب الوجود کے نام سے پہچانتے ہیں اور بس - (ان کی نظر میں) وہ ایک ایسا موجود ہے جو بشر سے بالکل بیگانہ ہے اس نے انسان کو صرف پیدا کر دیا ہے اور اسے دنیا میں بھیج دیا ہے لیکن قرآن کا خدا ایک " مطلوب " ومحبوب ہے ، انسان کی دلبستگی کا سرمایہ ہے ، وہ انسان کو پرجوش بناتا اور قربانی و فداکاری پر آمادہ کرتا ہے ، کبھی کبھی تو اس کی رات کی نیند اور دن کی راحت کو بھی چھین لیتا ہے کیونکہ وہ ایک فوق العادۃ مقدس خیال وتصور میں محو ہو جاتا ہے ۔

اسلامی فلاسفہ نے قرآن سے آشنا ہونے اور قرآنی مفاہیم و مطالب کو پیش کرنے کے نتیجہ میں الٰہیات کی بحث کو اس کے اوج کمال تک پہنچا دیا ہے ۔ کیا یہ بات ممکن ہے کہ ایک " اُمّی " اور ناخواندہ شخص جس نے (دنیا میں) نہ تو کسی معلّم کو دیکھا اور نہ کسی مکتب میں گیا اپنے پاس اور اپنی طرف سے الٰہیات میں اس قدر ترقی کر جائے کہ افلاطون وارسطو جیسے فلاسفہ سے ہزاروں سال آگے بڑھ جائے ؟ ۔

قرآن ، توریت اور انجیل :

قرآن نے توریت اور انجیل کی تصدیق کی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ ان کتابوں میں تحریف کی گئی ہے اور خیانت کار انسانوں کے ہاتھ ان کتابوں کی تحریف میں ملوّث ہیں ، قرآن نے الٰہیات پیغمبروں کے واقعات اور قصّوں اور چند دوسرے مقررات اور معینہ امور کے بارے میں ان دونوں کتابوں کی غلطیوں کی اصلاح وتصحیح کی ہے ، اس کا ایک نمونہ تو وہی تھا جس کا تذکرہ شجرۂ ممنوعہ اور خطاء آدم کے بارے میں ہم پہلے کر چکے ہیں قرآن نے خدا کو ایسی چیزوں سے جیسے کشتی لڑنا اور پیغمبروں کو نامناسب باتوں کی طرف منسوب ہونے

(۱) سورۂ اسراء ۴۴ ۔

سے جو گذشتہ کتابوں میں ذکر کی گئی ہیں، پاک و منزّہ قرار دیا ہے اور یہ خود اس کتاب کی حقانیت کی ایک دلیل ہے۔

تواریخ اور قصّے : قرآن مجید نے ایسے تاریخی واقعات اور قصّے بیان کیے ہیں کہ اس زمانہ کے لوگ ان کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے تھے، خود پیغمبرؐ بھی ان سے لاعلم تھے۔ " ماكنت تعلمها انت ولا قومك " (۱)، " انھیں نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم ہی جانتی تھی"۔ اور عرب کے تمام لوگوں میں سے کوئی ایک شخص بھی اس کا مدعی نہیں ہوا کہ ہم ان قصّوں کو جانتے ہیں، قرآن نے ان قصّوں کو بیان کرنے میں توریت و انجیل کی پیروی نہیں کی ہے، البتّہ ان کی اصلاح ضرور کر دی ہے۔ قوم سبا، قوم ثمود وغیرہ کے بارے میں عصرِ جدید کے مؤرخین کی تحقیقات بھی قرآنی نظریہ کی تائید کرتی ہیں۔

قرآن اور آئندہ کی خبریں (پیشین گوئی) : قرآن مجید نے جس وقت ۶۱۵ء میں ایران نے روم کو شکست دی اور یہ امر قریش کی مسرّت و خوشی کا باعث ہوا تو پوری قاطعیت اور یقین کے ساتھ کہا کہ دس سال سے کم ہی عرصہ میں روم ایران کو شکست دے گا، اس قضیہ کے بارے میں بعض مسلمانوں اور بعض کافروں کے درمیان شرط بندی ہو گئی، بعد میں ویسا ہی ہوا جیسا کہ قرآن نے خبر دی تھی، اسی طرح قرآن نے پورے قطع و یقین کے ساتھ خبر دی کہ جو شخص پیغمبر اکرمؐ کو ابتر (مقطوع النسل) کہتا ہے وہ خود ہی مقطوع النسل ہے، اس وقت اس شخص کے کئی بیٹے تھے لیکن سب کے سب صرف دو تین نسلوں کے اندر تدریجاً بالکل ختم ہو گئے۔ یہ ساری باتیں اس کتاب کے معجزہ ہونے کا پتہ دیتی ہیں۔ قرآن کے اندر اور بھی علمی و معنوی معجزات

(۱) سورۂ ہود ۴۹۔

موجود ہیں جو فلسفی، طبیعی اور تاریخی علوم سے مربوط و متعلق ہیں۔

(۶) **اسلام کی امتیازی خصوصیات :** اسلام، دینِ خدا کا نام ہے جو یکتا ہے، تمام پیغمبر اسی کی تبلیغ کے لیے بھیجے گئے ہیں اور سب نے اسی دین کی طرف دعوت دی ہے، اس دین خدا کی جامع و کامل شکل و صورت حضرت خاتم الانبیاء جناب محمدؐ ابن عبداللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ذریعہ سے لوگوں کے سامنے پیش کی گئی اور نبوّت کا سلسلہ ختم ہوگیا اور آج یہ دین اسی نام (اسلام) سے دنیا میں پہچانا جاتا ہے۔

اسلامی تعلیمات جن کی تبلیغ پیغمبرِ اسلامؐ کے ذریعہ سے ہوئی، اس لحاظ سے کہ یہ دینِ خدا کی کامل و جامع صورت میں ہیں اور اس واسطے کہ ہمیشہ کے لیے انسان کی راہبر ہیں خاص امتیازی خصوصیات کی حامل ہیں جو دورۂ ختمیّت سے مناسبت رکھتی ہیں۔ یہ ممیّزات و مشخصات تمام کے تمام گذشتہ دوروں میں جو بشر کے بچپنے کے دور تھے۔ وجود میں نہیں آسکتے تھے۔ اس لیے کہ ان مشخصات میں سے ہر ایک اسلام شناسی کے لیے معیاری حیثیت رکھتا ہے اور ان معیاروں اور پیمانوں کی روشنی میں جن میں سے ہر ایک اسلامی تعلیمات کا اصول ہے اور ان میں ہر ایک سے اسلام کی معرفت ۔اگرچہ اجمالی صورت میں حاصل کی جاسکتی ہے اور نیز ان معیاروں کے پیشِ نظر معلوم کیا جاسکتا ہے کہ فلاں تعلیم اسلامی ہے یا نہیں ہے۔ ہم اس کے مدّعی نہیں ہیں کہ ہم ان تمام معیاروں کو یہاں جمع کر سکتے ہیں، لیکن ہم یہ کوشش ضرور کریں گے کہ حتی الامکان ان سب کی ایک جامع صورت پیش کریں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ ہر مکتب ہر مسلک اور ہر نظریہ، بشر کی نجات و رستگاری اور کمال سعادت کے لیے ایک قسم کے احکام اور معیار پیش کرتا ہے جو بایدھا (یہ کرنا چاہیے)، نبایدھا (یہ نہیں کرنا چاہیے)، شایدھا (ایسا ہونا چاہیے)، نشایدھا (ایسا نہ ہونا چاہیے) کے جامع عناوین کے

تحت فرد اور معاشرہ کے لیے ہوتے ہیں۔

لیکن یہ تمام بایدھا و نبایدھا اور شایدھا ونشایدھا کے عناوین ایک خاص فلسفہ رکھتے ہیں جو انکی توجیہ کرتا ہے یعنی اگر کوئی مکتب ایک قسم کے احکام و دستورات پیش کرتا ہے تو اس کے لیے لازم و ضروری ہے کہ ان کے لیے ایک فلسفہ اور اسی طرح وجود دنیا کے معاشرہ اور انسان کے بارے میں کائناتی مطالعہ (جہاں بینی) پر بھروسہ کرے اور اس کا سہارا لے مثلاً چونکہ ہستی و وجود ایسا ہے اور انسان یا اس کا معاشرہ اس طرح کا ہے لہٰذا ایسا ہونا چاہیے اور ویسا نہیں ہونا چاہیے۔

جہاں بینی یعنی دنیا، انسان اور معاشرہ کے بارے میں بہت سے افکار اور تفسیروں اور تحلیلوں کا مجموعہ، کہ دنیا اس طرح کی ہے یا اس طرح کی، ایسا قاعدہ رکھتی ہے، اس طرح ترقی کرتی ہے، فلاں مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے یا نہیں کرتی، اس کا کوئی مبدء ہے یا نہیں ہے، اس کی کوئی انتہا ہے یا نہیں ہے یا مثلاً انسان ایسی فطرت وطبیعت رکھتا ہے۔ کسی خاص فطرت کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے یا نہیں، مختار اور آزاد ہے یا مجبور؟ طبیعت میں ایک منتخب واقعیت موجود ہے جس کو قرآن کے الفاظ میں اصطفا شدہ کہتے ہیں یا ایک اتفاقی واقعہ ہے یا تاریخ اور معاشرہ پر جن قوانین کی حکومت ہے وہ کون سے قوانین ہیں؟ وغیرہ وغیرہ

مکتب و مسلکِ اجتماعی، جہاں بینی (عقیدہ) پر قائم ہے اور یہ کہ کیوں اِس طرح یا اُس طرح ہونا چاہیے یا کیوں اسطرح جینا یا جانا یا ہونا یا بنانا چاہیے؟ اس عقیدے کے تحت ہے کہ دنیا یا سماج یا انسان کے بارے میں اس کا عقیدہ اور نظریہ ایسا ہے۔ ہر مسلک اور ہر آئیڈیالوجی (عقیدے) کی علت اس کی کائناتی مطالعے کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے اور اصطلاح میں آئیڈیالوجی "حکمتِ عملی ہے" اور جہاں بینی (کائناتی مطالعہ "حکمتِ نظری" کی قسم سے ہے، حکمتِ عملی کی ہر نوع حکمتِ نظری کی نوعِ خاص پر مبنی ہوتی ہے۔ مثلاً سقراط کی حکمتِ عملی اس خاص نظریہ کی بنیاد پر ہے جو سقراط

دنیا کے بارے میں رکھتا ہے اور وہی خاص نظریہ سقراط کی حکمتِ نظری ہے۔ اسیطرح اپیکور (EPICURE) (مشہور یونانی فلسفی) کی حکمتِ عملی کا رابطہ بھی اس کی حکمتِ نظری سے ہے اور اسی طرح دوسروں کا بھی۔ پس آئیڈیالوجی (نظریات) کیوں آپس میں مختلف ہیں؟ کیونکہ کائناتی مطالعے مختلف ہیں، یعنی آئیڈیالوجی (عقیدہ ونظریہ) جہاں بینی (کائناتی مطالعہ) کا تابع ہوتا ہے۔

دوسری سمت، جہاں بینی جس کو جہاں شناسی بھی کہا جا سکتا ہے یہ کیوں مختلف ہے؟ کیوں ایک مکتب دنیا کو اس طرح دیکھتا ہے اور دوسرا دوسری طرح ؟ اس سوال کا جواب اتنا آسان نہیں ہے، بہت سے مفکرین جب اس منزل تک پہنچتے ہیں تو فوراً منزلِ اجتماعی اور طبقاتی حالت کا شاخصانہ درمیان میں لاکھڑا کرتے ہیں اور اس امر کا دعوٰے کرنے لگتے ہیں کہ طبقاتی موقع ومحل اور صورتِ حال کے لحاظ سے ہر شخص کا علیحدہ علیحدہ ایک خاص زاویہ نگاہ ہوتا ہے اور وہی طبقاتی نظام ہر شخص کو ایک خاص قسم کی عینک جہاں شناسی کے لیے چڑھا لیتا ہے، انسان کا اپنے معاشرہ سے رابطہ۔ ان چیزوں سے جو معاشرہ میں پیدا اور تقسیم ہوتی ہے، ان کی پیدائش اور تقسیم کی کیفیت سے اور اس کے نتیجہ میں خود اس انسان کی محرومی ونامحرومی سے اس کے اعصاب اور اس کی روح و روان میں عکس العمل پیدا کرتی ہیں اور اس کی اندرونی حالت کو ایک خاص تشکل دے دیتی ہیں اور اس کی اندرونی اور ذہنی خاص حالت اس کے فکرو اندیشہ، نتیجہ گیری اور چیزوں کے بارے میں اس کی قوتِ فیصلہ کو متاثر کرتی ہے۔

بقول مولانا رومی:

(۱) چوں تو برگردی و برگردد سرت
خانہ را گردندہ بیند منظرت

جب تمہیں چکر آنے لگے اور تمہارا سر گھوم رہا ہو
تو تمہاری نگاہوں کے سامنے گھر بھی گھومتا ہوا نظر آئیگا

(۲) ور تو در کشتی روی بر یم روان
ساحل یم را چو خود بینی دوان

اور اگر تم کشتی میں بیٹھے سمندر کی سطح پر بہتے جارہے ہو
تو سمندر کا کنارا بھی تمہیں تمہاری ہی طرح رواں دکھائی دے گا

(۳) گر تو باشی تنگ دل از ملحمہ — تنگ بینی جوّ دنیا را ہمہ

اگر تم قتل و غارت کے حوادث سے تنگ دل ہو — توتمیں دنیا کی یہ وسیع فضا بھی تنگ معلوم ہو گی۔

(۴) ور تو خوش باشی بہ کام دوستاں — این جہاں بنمایدت چوں بوستاں

اوراگرتم دوستوں کی مقصد براری سے خوش ہو — تو یہ پوری دنیا تمہیں ایک ہرا بھرا باغ معلوم ہوگی۔

(۵) چوں تو جزوِ عالمی پس اے مہیں — کُلِ آنرا ہمچوں خود بینی یقین

چونکہ تو بھی اسی عالم کا ایک جزو ہے (اسی وجہ سے) — اس کل دنیا کو اپنے ہی مانند سمجھتا ہے

(۶) ہر کرا افعال دام و دد بود — بر کریمانش گمانِ بد بود

جس شخص کے کام چوپایوں اور درندوں کے ہونگے — اسکو شریفوں اور بزرگوں کے بارے میں بھی بد گمانی ہو گی

اس نقطۂ نظر کے لحاظ سے کوئی بھی شخص اپنے نظریہ کو صحیح اور دوسروں کے نظریہ کو غلط نہیں کہہ سکتا، کیونکہ نظریہ ایک نسبتی امر ہے اور ہر شخص کا نظریہ اس طبیعی اوراجتماعی ماحول کا ماحصل ہوتا ہے اور ہر شخص کے لیے وہی صحیح ہے جس کو وہ دیکھتا ہے۔ لیکن مطلب اتنا سادہ اور معمولی نہیں ہے، اس بارے میں کہ انسان کی فکرو نظر کافی حد تک اس کے ماحول کے زیر تأثیر ہوتی ہے کوئی بحث نہیں ہے لیکن یہ کہ انسان کے لیے ایک آزاد مرکز فکرو اندیشہ ہے جس کے ذریعہ وہ ہر طرح کی تأثیر سے اپنے کو آزاد و محفوظ رکھ سکتا ہے اور جس کو اسلام کی زبان میں "فطرت" کہا گیا ہے، نفی و انکار کے قابل نہیں ہے اور کسی دوسری جگہ اور دوسرے موقع پر اس کے بارے میں تفصیل کے ساتھ ہمیں بحث و گفتگو کرنا چاہیے۔

بالفرض اگر ہم انسان کی اصالت اور اس کے استقلال کو یعنی اسکی واقع بینی کو اس سے سلب کرنا چاہیں تو بھی (جہاں بینی وجہاں شناسی کے مرحلہ) میں انسان کو سرزنش کرنا قبل از وقت ہوگا۔ ان فلسفیوں اور دانشوروں کے نزدیک جو ان مسئلوں کا نزدیک سے مطالعہ کرتے رہتے ہیں، جو بات آج مسلّم ہے وہ یہ ہے کہ جہاں بینیوں اور جہاں شناسیوں کے نظریات کے

رنگا رنگ ہونے کی اصل اور جڑ کو، معرفت شناسیوں میں (یعنی) اس چیز میں جس کو آج نظریۂ معرفت یا نظریۂ شناخت کا نام دیا گیا ہے۔ تلاش کرنا چاہیے۔ (۱)

اکثر فلاسفہ "معرفت شناسی" کی طرف متوجہ ہوئے ہیں، یہاں تک کہ ان میں سے بعض نے یہ دعوے کیا ہے کہ "فلسفہ" جہاں شناسی نہیں ہے، بلکہ معرفت شناسی کا نام فلسفہ ہے، جہان شناسیاں مختلف ہوتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ "معرفت" و "شناخت" کی تحصیل کے نظریات مختلف ہیں، ایک کہتا ہے کہ دنیا کو عقل کے ذریعہ پہچاننا چاہیے، تو دوسرا کہتا ہے کہ دنیا کو حواس خمسہ کے ذریعہ پہچاننا چاہیے، تیسرا کہتا ہے کہ نفس کی صفائی و پاکیزگی، نورانیتِ قلب اور الہام کے ذریعہ دنیا کو پہچاننا چاہیے کسی کی نظر میں شناخت اور پہچاننے کے مرحلے ایک طرح کے ہیں تو دوسرے کی نظر میں دوسری طرح کے، عقل کا استعمال بعض کے نزدیک محدود ہے اور بعض کی نظر میں لامحدود، شناخت کے سرچشمے کیا ہیں؟ اس کا معیار کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

پس معلوم ہوا کہ ہر مکتب کا نظریہ اس کی جہاں بینی پر مبنی ہے اور اس کی جہاں بینی معرفت و شناخت کے بارے میں اس کے نظریہ پر مبنی ہے، ہر آئیڈیالوجی کا ترقی پانا اس کی جہاں بینی کے ترقی پانے سے وابستہ ہے اور اس کی جہاں بینی کا ترقی پانا اس کی معرفت شناسی کے ترقی پانے پر موقوف ہے، درحقیقت ہر مکتب کی حکمتِ عملی اس کی حکمت نظری سے وابستہ ہے اور اس کی حکمت نظری اس مکتب کی منطق اور نظریہ سے وابستہ ہے، پس ہر مکتب کو چاہیے کہ پہلے مرحلہ میں اپنی منطق کو معین و مشخص کرے۔ اسلام اگرچہ ایک فلسفی مکتب نہیں ہے اور اُس نے فلسفہ اور فلسفیوں کی زبان واصطلاح میں لوگوں سے گفتگو نہیں کی ہے بلکہ اسلام اپنی ایک مخصوص زبان رکھتا ہے جس سے عموماً تمام طبقے اپنے فہم وادراک، صلاحیت واستعداد کے مطابق بہرہ ور ہوتے

(۱) کتاب "اصول فلسفہ و روش رئالزم[1]" جلد اوّل بخصوصاً مقالہ چہارم "ارزش معلومات" میں اس قسم کے مطالب سے متعلق تفصیلی بحث کی گئی ہے اور ایک کتاب جو زیر نظر ہے "شناخت" کے عنوان سے منتشر ہوگی اس میں اس مسئلے پر مفصل بحث ہوگی۔

[1] رئالزم، حقیقت جوئی حقیقت بینی۔

ہیں، لیکن اس نے اپنے مطالب کی گہرائیوں میں ان تمام مسائل کے بارے میں اپنی بات پیش کی ہے اور یہ بڑی حیرت میں ڈالنے والی بات ہے۔ اس نے اپنا نظریہ اس طریقہ سے پیش کیا ہے کہ اس کو اندیشۂ عملی کے "پلاننٹ" کی صورت میں اور اس کی جہاں بینیوں کو ایک حکمتِ نظری کی شکل میں اور اس کے نظریات کو معرفت شناسی کے باب میں ایک منطق کے اصول پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہمیں اس مقام پر ایک اشارہ پر اکتفا کر کے آگے بڑھ جانا چاہیے (کیونکہ) اسلامی آئیڈیالوجی، جہاں بینی اور معرفت شناسی کی تدوین کے لیے خصوصاً اس بارے میں۔ علماء اسلام خواہ وہ فقہاء ہوں یا حکماء و عُرفاء اور دوسرے تمام صاحبان نظر کے گرانقدر و گرانبہا نظریات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کئی بڑی بڑی جلدوں کی ضرورت ہوگی یہاں ہم فقط ایک فہرست۔ اگرچہ ناقص۔ پیش کرتے ہیں، ممکن ہے آئندہ کسی موقع پر اس کی تکمیل ہو جائے۔ اس مقام پر جب کہ ہم اسلام کے مشخصات کے زیرِ عنوان اسلامی نظریات کے اصلی خط و خال نمایاں کرنے کا قصد رکھتے ہیں، انھیں تین حصوں پر تقسیم کرتے ہیں معرفت شناسی کے مشخصات، جہاں بینی و جہان شناسی کے مشخصات اور آئیڈیالوجیکل مشخصات۔

(الف) معرفت و شناخت کے لحاظ سے

۱۔ کیا شناخت ممکن ہے؟ اس مسئلہ کا یہ پہلا سوال ہے جو ہمیشہ درپیش رہا ہے اور رہے گا بہت سے دانشمند حقیقی معرفت و شناخت کو ناممکن سمجھتے ہیں اور انسان کو ان چیزوں کی واقفیت سے جو دنیا میں ہیں اور ہوتی رہتی ہیں۔ پہچاننے اور انکی حقیقت سے آگاہ ہونے سے مجبور و عاجز سمجھتے ہیں اور یقین (یعنی قطعی و ناقابل تردید اور واقع کے مطابق علم) کو ایک امر محال شمار کرتے ہیں۔ لیکن قرآن اس بنا پر کہ اس نے خدا، دنیا، انسان اور تاریخ کو پہچاننے کی دعوت دی ہے اور اس بنا پر کہ اس نے آدمؑ اوّل کے قصہ میں جو ایک انسان کا قصہ ہے ان کو تمام اسماء الٰہی (عالم

کے حقائق، کی تعلیم کے لائق جانا ہے اور اس بنا پر کہ اس نے بعض موقعوں پر علم بشر کو علم پروردگار (جو عین حقیقت ہے) کے کسی جزئی حصہ پر محیط اور حاوی ہونے کی قسم سے سمجھا ہے،

"ولا یحیطون بشیئ من علمه الا بما شاء" (۱) معرفت و شناخت کو ممکن جانتا ہے۔

۲۔ شناخت کے سرچشمے کیا ہیں؟ قرآن کریم کی نظر میں معرفت و شناخت کے سرچشموں سے مراد طبیعت یا آفاقی نشانیاں، انسان یا انفسی نشانیاں، تاریخ یا اقوام اور ملتوں کے واقعات و سرگذشت عقل یا فطرت کے بنیادی اصول، قلب یعنی دل صفائی و پاکیزگی کے لحاظ سے، گذرے ہوئے لوگوں کے علمی اور قلمی آثار۔ قرآن نے اپنی بہت سی آیتوں میں طبیعت زمین و آسمان کے بارے میں غور و فکر کی دعوت دی ہے، "قل انظروا ماذا فی السموات والارض۔ (۲)" (اے حبیب) کہہ دو! تم لوگ دیکھو اور غور کرو کہ آسمانوں اور زمین میں کیا چیزیں ہیں" اسی طرح گذشتہ قوموں کی تاریخ میں تعقل و تدبر کی طرف، سبق حاصل کرنے کے لیے بلایا ہے" "افلم یسیروا فی الارض فتکون لهم قلوب یفقهون بها او آذان یسمعون بها" (۳) "کیا وہ لوگ زمین پر سفر نہیں کرتے (زمین پر گذرے ہوئے لوگوں کے آثار نہیں دیکھتے) تاکہ ان کے دل ایسے ہو جائیں جن سے وہ سمجھنے لگیں اور کان ایسے ہو جائیں جن سے وہ سننے لگیں"

اسی طرح قرآن عقل اور عقلی فطری مبادیات کو بھی معتبر جانتا ہے اور اپنے استدلالوں میں ان پر اعتماد کرتا ہے" قل لو کان فیهما آلهة الا الله لفسدتا" (۴) (کہہ دو! کہ اگر ان دونوں (آسمان و زمین۔ تمام موجودات) میں ایک خدا کے سوا کوئی خدا ہوتے تو یہ دونوں تباہ ہو جاتے" اور ان کا نظام قائم نہ رہتا (برہان تمانع) یا پھر فرماتا ہے۔" ما اتَّخذ اللهِ مِنْ وَلَدٍ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ سُبْحَانَ اللهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ" (۵) "خدا نے کوئی بیٹا اختیار نہیں کیا ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی دوسرے خدا ہیں (کیونکہ اگر ایسا ہوتا) تو ہر خدا اپنی اپنی مخلوقات کو اپنے ساتھ مختلف سمتوں میں لے جاتا اور ان خداؤں میں سے بعض بعض پر اپنی بلندی و برتری جتاتے

(۱) سورۂ بقرہ۔ آیۃ الکرسی۔ (۲) سورۂ یونس ۱۰۱، (۳) حج ۴۶۔ (۴) انبیاء ۲۲۔ (۵) مومنون ۹

خدا پاک ومنزّہ ہے ان چیزوں سے جن سے وہ لوگ اس کو متصف کرتے ہیں" (یہ برہانِ ہم آہنگی و وحدتِ جہتِ نظام ہے) اور اسیطرح قرآن قلب اور دل کو الٰہی الہاموں اور القاؤں کے ایک سلسلہ کا حفاظت خانہ سمجھتا ہے، جو شخص جسقدر بھی اسے پاک و صاف کرنے اور پاکیزہ رکھنے اور خدا کی طرف متوجہ کرنے اور اخلاص وعبودیت میں خاص توجہ کے ذریعہ اس کو معنوی وروحانی غذا پہنچانے کی کوشش کرتا رہے گا اسی قدر الہامات والقاءات کے ایک سلسلہ سے بہرہ اندوز ہوتا رہے گا۔ انبیاء کی وحی اسی نوعِ معرفت کا اعلیٰ مرتبہ ہے۔

جس طرح سے کہ قرآن نے قلم وکتاب اور تحریر کی قدر وقیمت کی طرف بار بار اشارہ کیا ہے اور کئی موقعوں پر ان چیزوں کی قسم کھائی ہے " والقلم ومایسطرون" (۱)

(۳) شناخت کے آلات واوزار کیا ہیں؟ معرفت وشناخت کے اوزار سے مراد حواس، قوّت تفکر واستقلال، نفس کی پاکیزگی وصفائی، دوسرے لوگوں کے علمی آثار ہیں۔ سورہ مبارکہ نحل میں ارشادِ خداوندی ہے :۔" واللهُ اخرجکم من بطون امهاتکم لاتعلمون شیئا وجعل لکم السمع والابصار والافئدة لعلکم تشکرون"۔ (نحل ۷۸) خدا نے تمہیں تمہاری ماؤں کے شکموں سے باہر نکالا اس حالت میں کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور تمہیں کان اور آنکھیں اور دل عطا کیے تاکہ تم ان نعمتوں کا شکر ادا کرو اور ان سے کماحقہ نفع حاصل کرو۔ اس آیۂ کریمہ میں صاف طور پر بیان ہوا ہے کہ انسان، افلاطون کے نظریہ کے برعکس (۲) ـ اپنے پیدا ہونے کے وقت ہر قسم کے علم ومعرفت سے بیگانہ

(۱) سورۂ قلم۔ (۲): افلاطون کا مشہور نظریہ یہ ہے کہ انسان کی روح عالم "مثل" میں پہلے موجود تھی اور جب وہ اس دنیا میں آتی ہے تو سب چیزوں کو جانتی ہوتی ہے لیکن انہیں بھولی ہوئی ہوتی ہے جب اس دنیا میں دوبارہ ان حقائق سے واقف ہوتی ہے تو یہ اس کے لیے "تذکر" یعنی یاد آوری ہوتی ہے نہ کہ نیا علم"۔ اس آیت میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ اس نظریۂ فطرت کے جس کا ذکر قرآن میں ہے مخالف ومنافی نہیں ہے۔ کیونکہ امورِ فطری قرآن کی اصطلاح میں اس معنی میں نہیں ہیں کہ انسان پیدا ہوتے ہی تمام امور کو بالفعل جانتا ہے، بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ انسان کا جوہر ایسا جوہر ہے جو رشد وتکامل کی حالت اور زندگی کے سفر میں علاوہ ان چیزوں کے جنہیں وہ اپنے حواس کے ذریعہ معلوم کرتا ہے ابتدائی اصول کا ایک سلسلہ بھی اس کے لیے منکشف ہوتا ہے جنکا تصور ہی انکی قطعی ولازمی تصدیق کے لیے کافی ہے اور یہ جو قرآن میں تعلیم کے علاوہ "تذکر" کا ذکر آیا ہے تو یہ فطرت کا "تذکر" ہے اسی معنی میں جو اوپر بیان ہوا لہذا آیاتِ "تذکر" اور آیات فطرت کے درمیان اور آیۂ سورۂ نحل اور اسی مضمون کی دوسری آیتوں کے درمیان کوئی تناقض وتضاد نہیں ہے۔ مولف (ق۔ س)

ہوتا ہے اور خدا نے انسان کو حواس عطا کیے ہیں تاکہ وہ ان کے ذریعہ سے دنیا کا مطالعہ کرے اور اس کو ضمیر اور تجزیہ و تحلیل کی قوت عنایت فرمائی ہے تاکہ جن چیزوں کو وہ حواس کے ذریعہ حاصل کرتا ہے اب دوسرے مرحلہ میں ان پر غور و فکر کرے انکی گہرائیوں میں دیکھے اور انکی حقیقت کو اور ان قوانین کو جو ان اشیاء پر حاکم ہیں معلوم کرے۔ اس آیت میں صاف صاف لفظوں میں حواس کو (جن میں سے کان اور آنکھیں سب میں اہم ہیں بطور نمونہ ان کا ذکر ہوا ہے) معرفت و شناخت کے اوزار و آلات (شناخت سطحی اور شناخت کے پہلا مرحلہ کے معنی میں) اور دل (فؤاد) کو بھی پہچاننے اور علم حاصل کرنے (اور اصطلاحی معنوں میں منطقی و غائر شناخت کے مرحلہ میں) کے اوزار کی حیثیت سے پہنچوایا گیا ہے اس آیہ میں ضمناً شناخت کے بارے میں ایک دوسرے مسئلہ کی طرف بھی اشارہ ہے اور وہ شناخت کے مرحلوں کا مسئلہ ہے۔

قرآن جسطرح حواس اور قوت تفکر کو شناخت کے آلات و اوزار سمجھتا ہے اسی طرح تزکیہ و تصفیۂ نفس تقویٰ اور پاکیزگی کو بھی شناخت کا ایک وسیلہ سمجھتا ہے، بہت سی آیتوں میں اس مطلب کیطرف اشارہ یا تصریح کی گئی ہے۔ " ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا " (انفال ۲۹)، اگر تم اپنے کو ان باتوں سے جو خدا کو پسند نہیں ہے، بچاؤ گے اپنے دل کو پاک و صاف محفوظ رکھو گے تو خداوند عالم تمہارے واسطے حق و باطل کے درمیان فرق پیدا کرنے کا ایک ذریعہ معین فرمائے گا۔" ونفس وما سوّاها فالهمها فجورها وتقويها قد افلح من زكّيها وقد خاب من دسّٰها "(۱)، قسم ہے انسان کی جان کی اور اسکی آراستگی و اعتدال کی، کہ خدا نے اس کو اس کی ناپاکی اور پاکی کے بارے میں الہام کیا ہے اور اس کو سمجھایا، جس شخص نے اس کا تزکیہ کیا اس نے فلاح پائی اور جس نے اس کو آلودہ کیا وہ ناکام ہوا۔

علم حاصل کرنا، یاد کرنا، کتاب کو پڑھنا بھی ان وسیلوں اور آلوں میں سے ہے کہ اسلامی تعلیمات نے اس کی طرف توجہ کی ہے اور اس کو آئینی طور پہ ایک خاص اہمیت دی ہے، اس

(۱) سورۂ والشمس وضحٰها۔

کی اہمیت کے لیے یہی کافی ہے کہ پیغمبرؐ پر وحی کا آغاز لفظ "اِقرء" یعنی پڑھو سے ہوتا ہے، قرائت یعنی (کتاب سے) کسی عبارت کا پڑھنا ہے " اقرء باسم ربّك الّذی خلق خلق الانسان من علق اقرء وربّك الاکرم الذّی علّم بالقلم علّم الانسان مالم یعلم۔ (۱)

(اے رسول) پڑھو! اپنے پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو لبستہ خون سے پیدا کیا (یا اس حیوان سے جو جونک سے مشابہہ ہوتا ہے) پڑھو! اور تمہارا سب سے زیادہ کریم وبزرگ پروردگار وہ ہے جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ علم سکھایا، انسان کو وہ باتیں پڑھا دیں جنھیں وہ نہیں جانتا تھا۔"

(۴) شناخت کے موضوعات : کون سی چیزیں پہچاننے کے لائق ہیں جنھیں پہچاننا چاہیے؟ شناخت کا موضوع، خدا ہے، دنیا ہے، انسان ہے اور معاشرہ اور زمانہ ہے یہ سب شناختنی بھی ہیں اور انہیں پہچاننا بھی چاہیے

(ب) جہان بینی (تصور کائنات) کے لحاظ سے : یہ کتاب جو اسلامی جہان بینی کا ایک مقدمہ ہے اس کا اصل مقصد اسی مطلب کی توضیح دینا ہے اور اس کتاب کے مطالب کے ضمن میں ان نکات کو بھی سمجھا جا سکتا ہے لیکن اس لحاظ سے کہ مضمون کا سلسلہ منقطع نہ ہونے پائے ان مشخصات کو بہت مختصر اور خلاصہ کے طور پر ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔ (۱) جہان، دنیا "از اوئی" یعنی "اس کی طرف سے" کی ماہیت رکھتی ہے یعنی دنیا کی واقعیت وموجودگی "اس طرف سے" دی ہوئی واقعیت وموجودگی ہے، کسی چیز کا کسی مادی چیز سے ہونا اس لحاظ سے کہ اس کا تمام وجود اسکی حقیقت اور واقعیت ہو یا نہ ہو میں فرق ہے۔ جیسے فرزند کا وجود ماں باپ کی بہ نسبت کہ فرزند کا وجود ان کے وجود سے ہے لیکن اس کی وجودی واقعیت ماں، باپ کی طرف نسبت اور اضافی واقعیت کے علاوہ ہے، لیکن دنیا جو "از اوئی" یعنی " اس کی طرف سے" کی ماہیت رکھتی ہے تو اس معنی میں کہ اسکی تمام واقعیت خدا سے منسوب ہے۔

(۱): سورۂ علق/ ۱-۵

اس کی واقعیت اور خدا سے اضافت اور نسبت سب ایک ہے مخلوق ہونے کے یہی معنی ہیں، اگر اس معنی کے علاوہ ہوگا تو وہ تولید ہوگی نہ کہ تخلیق اور اس کی ذات" لم یلد ولم یولد" ہے اور اس صورت میں دنیا زمانی آغاز وابتدا رکھتی ہو یا نہ رکھتی ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر دنیا آغاز زمانی رکھتی ہو تو "از اوئی" کی ایک واقعیت محدود ہے اور اگر نہیں رکھتی تو "از اوئی" کی ایک واقعیت نامحدود ہے۔ زمانی طور پر محدود ہونا اور نامحدود ہونا کسی مخلوق کی واقعیت و موجودگی اور اس کی تخلیق کی نسبت پر کسی طرح بھی اثر انداز نہیں ہوتا۔

(۲) دنیا جس کی واقعیت و موجودگی "از اوئی" یعنی اس سے ہے اور اصطلاح میں حادث ذاتی کہلاتی ہے، ایک حدوث زمانی بھی رکھتی ہے یعنی ایک بدلتی رہنے والی اور متحرک واقعیت بلکہ عین حرکت ہے اور جب دنیا عین حرکت ہے تو ایک حدوث مستمر ہے یعنی ہمیشہ اور دائمی طور پر خلق ہونے کی حالت میں ہے اور ہمیشہ حدوث و فنا کی حالت میں ہے، ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ہے کہ دنیا پیدا اور فنا نہ ہوتی رہتی ہو۔

(۳) اس دنیا کی موجودات و واقعیات دوسری دنیا جس کو جہان غیب کہا جاتا ہے۔ کی واقعیات کی تنزل یافتہ اور دوسرے درجہ و مرتبہ کی واقعیات ہیں۔ جو چیزیں اس دنیا میں مقدر و محدود کی حیثیت رکھتی ہیں وہ اس عالم جو اس دنیا سے پہلے سے ہے (یعنی جہان غیب) میں ایک غیر مقدور و غیر محدود شکل میں ہیں اور قرآن کے الفاظ میں خزانوں کی شکل میں موجود ہیں (۱)

"وان من شیئ الا عندنا خزائنه وما ننزله الا بقدر معلوم"(۲) "کوئی چیز نہیں ہے مگر یہ کہ اس کے خزانے اور معادن ہمارے پاس ہیں اور ہم ان کو نازل نہیں کرتے مگر بقدر معین"

(۴) یہ دنیا "بسوئے اوئی" یعنی اسی کی طرف کی ماہیت رکھتی ہے یعنی جس طرح کہ اس سے ہے اسی طرح "اسی کی طرف" بھی ہے۔ پس پوری دنیا مع اپنی تمام موجودات کے ایک (اس کی طرف سے) نزولی سفر طے کر چکی ہے اور اب" اسی کی طرف صعودی سفر کے طے کرنے کی حالت میں ہے

(۱) ملاحظہ فرمائیں تفسیر المیزان، زیر آیہ کریمہ" وعنده مفاتح الغیب لا یعلمها الا هو" انعام ۵۹ (۲) الحجر ۲۱

سب کے سب خدا کے ہیں اور سب اسی کی طرف پلٹ کر جانیوالے ہیں۔" انا للّٰہ و انا الیہ راجعون"[۱]
" الا الی اللّٰہ تصیر الامور"[۲]، " آگاہ ہو جاؤ کہ تمام امور کی بازگشت اللّٰہ ہی کی طرف ہوگی" "وان الی ربّك منتھٰھا"[۳]، " بے شک ان چیزوں کی انتہا تمہارے پروردگار ہی کی طرف ہوگی"

(۵) دنیا ایک "علّی و مَعلولی" سببی اور مسببیّ مستحکم نظام رکھتی ہے ہر موجود پر الٰہی فیض اور اس کی قضا و قدر سب صرف اسی کے خاص علل و اسباب کی راہ سے جاری ہوتے ہیں۔ [۴]

(۶) علّت و معلول اسباب و مسبّبات کا یہ نظام مادّی اور جسمانی اسباب و مسببات پر منحصر نہیں ہے دنیا اپنے مادّی لحاظ سے مادّی، سببی اور مسببی نظام رکھتی ہے اور اپنے ملکوتی و معنوی لحاظ سے غیر مادی سببی و مسببّی نظام رکھتی ہے اور ان دونوں نظاموں کے درمیان کوئی اختلاف و تضاد نہیں ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنا وجودی مرتبہ و درجہ حاصل کر لیا ہے۔ فرشتے، روح، لوح و قلم، آسمانی و ملکوتی کتابیں ایسے واسطے اور وسیلے ہیں جن کے ذریعہ باذنِ پروردگار الٰہی فیض جاری ہوتے ہیں۔

(۷) دنیا پر ایسے مستقل اور غیر متخلّف آئین و قوانین کی حکمرانی ہے جو دنیا کے سببی و مسببّی نظام کا لازمہ ہے

(۸) دنیا ایک ہدایت یافتہ واقعیّت و موجود ہے، دنیا کی ترقی و تکامل ہدایت یافتہ تکامل ہے دنیا کے تمام ذرّات جس درجہ و مرتبہ کے بھی ہیں۔ نور ہدایت سے فیض یاب ہیں۔ غریزہ، فطری شعور، حِس، عقل، الہام اور وحی یہ سب دنیا کی ہدایتِ عامّہ کے مراتب و مدارج ہیں۔" قال ربنا الذی اعطٰی کل شیئٍ خلقه ثــم ھدٰی"[۵]، (موسیٰؑ اور ہارونؑ نے) فرعون سے کہا، ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے لائق خلقت عطا کی پھر اس کی ہدایت بھی کی۔

(۹) دنیا میں خیر بھی ہے اور شر بھی، موافقت بھی ہے اور مخالفت بھی، بخشش و سخاوت بھی ہے اور بخل و کنجوسی بھی، نور بھی ہے اور تاریکی بھی، دنیا، حرکت و ترقی کی حالت میں بھی ہے اور سکون و جمود کی حالت میں بھی، لیکن جو چیز محکم و مضبوط وجود رکھتی ہے۔ وہ خیر ہے، موافقت ہے، جود و سخا ہے، نور ہے، حرکت ہے۔

[۱] بقرہ ۱۵۶ [۲] سورہ شوریٰ ۵۳ [۳] النازعات ۴۴ [۴] مولف کی "عدل الٰہی" اور "انسان و سرنوشت" کتابیں ملاحظہ فرمائیں۔
[۵] سورۂ طٰہٰ ۵۰

شر، مخالفت، بخل، تاریکی اور سکون تبعی اور طفیلی موجودات ہیں، عین اسی حالت میں یہی تبعی و طفیلی امور نیکیوں کا دروازہ کھولنے اور موافقتوں، بخششوں، روشنیوں، حرکتوں اور ترقیوں میں ایک بنیادی کردار بھی رکھتے ہیں۔

(۱۰) دنیا، اس بنا پر کہ ایک زندہ اکائی ہے یعنی ذی شعور قوتیں دنیا کی تدبیر کرتی ہیں "فالمدبّرٰت امرا" (۱) اپنے اور انسان کے درمیان رابطہ و تعلق کے لحاظ سے عمل اور ردِّ عمل کی دنیا ہے یعنی انسان کے نیک و بد کی بہ نسبت خاموش نہیں ہے، جزاء و سزاء امداد و مکافاۃ اس دنیا میں بھی ہے علاوہ اس جزاء و سزاء کے جو آخرت میں ہوگی، شکر اور کفر دونوں یکساں نہیں ہیں، "لئن شکرتم لا زیدنکم ولئن کفرتم اِنّ عذابی لشدید" (۲) "اگر تم لوگ الٰہی نعمتوں کی قدردانی اور حق شناسی کرو گے اور مطلوبہ طریقہ سے ان سے فائدہ اٹھاؤ گے تو ہم ان نعمتوں کو تم پر اور زیادہ کر دیں گے اور اگر ناشکری کرو گے اور ان نعمتوں کو بیہودہ طریقہ سے اور مخالف راہ میں صرف کرو گے تو میرا عذاب بے شک بہت سخت ہے"۔

حضرت علی علیہ السّلام فرماتے ہیں، "لا یزھدنّک فی المعروف من لا یشکرک علیہ فقد یشکرک من لا یستمتع بشیئ منہ وقد تدرک من شکر الشاکر اکثر مما اضاع الکافر واللہ یحب المحسنین" (۳) اگر تم نے کسی کے ساتھ بھلائی کی اور اس نے تمہاری حق شناسی نہیں کی تو اس کی یہ حرکت تمہیں بھلائی کرنے سے بددل نہ کردے اور روک نہ دے کیونکہ اس کے بجائے تمہاری حق شناسی وہ کرے گا جو تمہاری بھلائی سے قطعاً کبھی بہرہ مند نہیں ہوتا اور تم اس بیگانہ شکر گذار کی طرف سے اس مقدار سے کہیں زیادہ پا جاؤ گے جتنا اس کفرانِ نعمت کرنے والے نے تمہارے حقِ نعمت کو ضائع کیا ہے اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے"۔ یعنی یہ دنیا اپنے پورے مجموعہ میں ایک باہم بستہ و پیوستہ کارخانہ اور ایک زندہ آرگنزم ہے، تم اس انتظار میں نہ رہو اور یہ امید نہ رکھو کہ تم سے جس نقطہ پر کوئی بھلائی واقع ہوئی ہے اسی نقطہ سے تم کو نیکی کا بدلہ

۱ : والنازعات ۵ ۲ : ابراہیم ۷ ۳ : نہج البلاغہ حکمت ۲۰۴

بھی ملے گا، کبھی کبھی بلکہ زیادہ تر تم سے نیکی کسی نقطہ پر واقع ہوتی ہے اور اس کا بدلہ کسی دوسرے ایسے نقطہ سے ملتا ہے جہاں سے تمہیں کوئی امید نہیں تھی کیوں؟ اس لیے کہ یہ دنیا خدا رکھتی ہے اور خدا نیکو کاروں کو دوست رکھتا ہے ۔

تو نیکی میکن و در دجلہ انداز — کہ ایزد در بیابانت دہد باز

تم نیکی کرتے رہو اور ان سب کو دجلہ میں ڈالدو — تاکہ خداوند عالم تمہیں صحرا میں اس کا بدلہ دے

(۱۱) اس دنیا کے بعد ایک دوسری دنیا ہے، وہ دنیا ابدیت کی دنیا اور جزاء و سزا کی دنیا ہے۔

(۱۲) انسان کی روح ایک جاودانی حقیقت ہے، ایسا نہیں ہے کہ انسان محض قیامت میں ایک زندہ کی صورت میں اٹھایا جائے گا، بلکہ دنیاوی موت اور قیامت کے درمیان بھی ایک منزل کا فاصلہ ہے جس میں انسان ایک قسم کی زندگی سے جس کو برزخی زندگی کہا جاتا ہے اور جو دنیوی زندگی سے زیادہ قوی اور زیادہ کامل ہے۔ بہرہ مند ہوتا ہے، قرآن مجید کی تقریباً بیس آیتیں انسان کی موت اور قیامت کے درمیان کی مدت اور جسم انسانی کے بوسیدہ ہو کر خاک ہو جانے کی حالت میں بھی انسان کی زندگی پر دلالت کرتی ہیں۔

(۱۳) زندگی اور اس کے بنیادی اصول یعنی انسانیت و اخلاق کے اصول جاودانہ اور لاتغیّر اصول ہیں اور جو قواعد متغیر اور نسبتی ہیں وہ فروع ہیں ایسا نہیں ہے کہ انسانیت کسی زمانہ میں کوئی چیز ہو اور دوسرے زمانہ میں کوئی دوسری چیز بن جائے جو پہلے کے بالکل مخالف ہو مثلاً کسی زمانہ میں انسانیت ابوذر ہونے میں ہو اور دوسرے زمانہ میں انسانیت معاویہ بن جانے میں ہو بلکہ جن اصول کی بنا پر ابوذر ابوذر ہیں اور معاویہ معاویہ، موسیٰؑ موسیٰؑ ہیں اور فرعون فرعون ہے وہ جاودانی اور غیر متغیر اصول ہیں

(۱۴) حقیقت بھی جاودانی اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہے، ایک علمی حقیقت اگر کلیۃً حقیقت ہے تو وہ ہمیشہ کے لیے حقیقت ہے اور اگر وہ حقیقت کلیۃً خطا ہے تو ہمیشہ کے لیے خطا ہے، اگر کسی

کا ایک جزء حقیقت ہے اور دوسرا جزء خطا ہے تو جو جزء حقیقت ہے وہ ہمیشہ کے لیے حقیقت ہے اور رہے گا اور جو جزء خطا ہے وہ ہمیشہ کے لیے خطا ہے اور ہوگا اور جو چیز متغیر و متبدل ہوتی ہے وہ واقعیت ہے اور وہ بھی مادی واقعیت ہیں، لیکن حقیقت یعنی انسان کے فکری اندیشے اور ذہنی معتقدات واقعیت سے منطبق ہونے اور منطبق نہ ہونے کے لحاظ سے ایک ثابت و قائم اور یکساں حالت رکھتی ہے۔

(۱۵) دنیا، زمین و آسمان حق و عدالت کے ساتھ قائم ہیں " ماخلقنا السمٰوات و الارض وما بینھما الّا بالحق " (۱) " ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو ان دونوں کے درمیان ہیں نہیں پیدا کیا مگر حق کے ساتھ "

(۱۶) اس دنیا میں الٰہی طریقہ، باطل کے خلاف حق کی آخری و نہائی فتح و پیروزی پر مقرر ہے حق اور اہل حق غالب و ظفرمند ہیں۔ " ولقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین انھم لھم المنصورون و ان جندنا لھم الغالبون " (۲) " ہماری قضا اور ہمارا فیصلہ اس امر پر ہو چکا ہے کہ ہمارے پیغمبر بے شک منصور و ظفرمند ہیں اور بے شک ہماری فوج (لشکر حق)، غالب و فاتح ہے۔

(۱۷) تمام انسان خلقت کے اعتبار سے برابر پیدا کیے گئے ہیں، کوئی انسان پیدائش کے اعتبار سے دوسرے انسان پر کوئی حقوقی امتیاز نہیں رکھتا، بزرگی اور فضیلت تین چیزوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ علم[۳] " ھل یستوی الّذین یعلمون والذین لا یعلمون " (۳) " راہِ خدا میں جہاد[۴] " فضل اللہ المجاھدین علی القاعدین اجرا عظیما " (۴)، تقوٰی[۵] و پاکیزگی۔ " ان اکرمکم عند اللہ اتقیٰکم " (۵)

(۱۸) اصل خلقت کے اعتبار سے انسان بہت سی فطری صلاحیتوں اور استعدادوں کا حامل ہوتا ہے، ان میں سے دینی اور اخلاقی فطرت بھی ہے۔ انسان کے ضمیر و وجدان کا اصلی سرمایہ اس

۱ : سورۂ احقاف ۳ ۲ : والصافات ۱۷۲ ۳ : سورۂ زمر ۱۳ ۴ : سورۂ نساء ۹۵ ۵ : حجرات ۱۳

کی خداداد فطرت ہے نہ کہ طبقاتی محل و مقام یا اجتماعی زندگی یا طبیعت کو اپنے اختیار میں لینے کے لیے جدوجہد، کیونکہ یہ سب انسان کے اکتسابی وجدان (ضمیر) میں مؤثر ہوتے ہیں، انسان اپنی انسانی فطرت کے لحاظ سے مخصوص ثقافت اور مخصوص آئیڈیالوجی کا مالک بن سکتا ہے اس کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ طبیعی ماحول کے خلاف، اجتماعی ماحول کے خلاف، تاریخی اسباب و عوامل کے خلاف اور اپنے وراثتی عوامل کے خلاف اٹھ کھڑا ہو اور اپنے کو ان سب کی قید سے آزاد کرلے۔

(۱۹) اس بنا پر کہ ہر فرد بشر فطری طور پر انسان پیدا ہوتا ہے، ہر انسان میں اگرچہ وہ بدترین انسان ہی کیوں نہ ہو، توبہ اور راہ راست کی طرف اس کی واپسی اور نصیحت قبول کرنے کی صلاحیت و استعداد موجود ہوتی ہے، اسی لیے پیغمبران الٰہی مامور ہیں حتیٰ کہ بدترین افراد اور اپنے دشمنوں میں سے سخت ترین دشمن کو بھی پہلے مرحلہ میں وعظ و نصیحت کریں اور اس کی انسانی فطرت کو بیدار کریں، پس اگر یہ چیز فائدہ مند نہ ہو تو پھر ان سے مقابلہ و جنگ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس پہلی مرتبہ جاتے وقت یہ وصیت کی گئی کہ فقل "هل لكَ اِلٰٓى اَن تَزَكّٰى وَاَهدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخشٰى" (۱) کہہ دو کہ کیا تو آمادہ ہے کہ اپنے کو نجاستِ کفر سے پاک کرلے؟ اور کیا میں تجھے تیرے پروردگار کی راہ بتا دوں تاکہ تو اس سے ڈرے؟

(۲۰) انسان باوجود اس کے کہ ایک مرکبِ حقیقی اور ایک حقیقی اکائی ہے۔ برخلاف مرکباتِ طبیعی جمادی و نباتی کے کہ ترکیب کی حالت میں مرکب ہونے والے اجزاء و عناصر اپنی ہُویت و استقلال کو مخل اور کھو دیتے ہیں اور ان کی آپس کی مزاحمت و مخالفت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ اس (انسان) کی خلقت میں جو متضاد عناصر کام میں لائے گئے ہیں وہ آپس کی مناسبت و ہم آہنگی کی وجہ سے اپنی ہُویت کو بالکلیہ ختم نہیں کر دیتے اور ایک باطنی کشمکش ان کو ادھر سے ادھر کھینچتی رہتی ہے یہ باطنی تضاد وہی ہے جس کو دینی زبان میں عقل و جہل کا تضاد یا عقل و نفس یا روح و بدن کا تضاد کہا جاتا ہے۔

۱؎ : والنازعات ۱۹

(۲۱) اس بنا پر کہ انسان مستقل روحانی جوہر کا مالک ہے اور اس کا ارادہ اس کی روحانی حقیقتِ ذات کے سرچشمہ سے پیدا ہوتا ہے، مختار و آزاد ہے، کوئی جبر یا کوئی ذاتی احتیاج اس کی آزادی اور اس کے اختیار کو اس سے چھین نہیں سکتی، اسی لیے وہ اپنا بھی جواب دہ ہے اور اپنے معاشرہ کا بھی ذمّہ دار و جواب دہ ہے۔

(۲۲) انسانی معاشرہ نے بھی، فردِ انسان کی طرح باوجود اس کے کہ ایک مرکب حقیقی ہے اور اپنے مرتّب کیے ہوئے قوانین، قاعدے اور دستورالعمل رکھتا ہے اور معاشرہ بحیثیت کل معاشرہ پوری تاریخ میں کبھی کسی خاص فرد کے ارادہ کا تابع نہیں رہا ہے۔ ان متضاد عناصر کی وجہ سے، جو انسانی معاشرہ کی تعمیر میں استعمال ہوئے ہیں یعنی فکری، صنفی، سیاسی، اقتصادی گروہ اپنی ہویت کو بالکل ختم نہیں ہونے دیتے، جنگ اور ستیز، جنگ سیاسی کی صورت میں یا اقتصادی فکری اور اعتقادی جنگوں کی صورت میں اور بالآخر جنگ اور ستیز رشد یافتہ اور کمال انسانیت پر پہنچے ہوئے انسانوں کے بلند اقدار اور آرمانوں اور حیوان صفت پست اقدار خواہشات کے درمیان، غرضیکہ جب تک پورا معاشرہ انسانیت کے اوج کمال پر نہ پہنچ جائے۔ یہ جنگ جاری رہے گی۔

(۲۳) خداوند عالم کسی انسان یا کسی قوم کی سرنوشت و قسمت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ آدمی یا وہ قوم خود اپنے حالات کو نہ بدلے۔" ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم"۔

(بقولِ علامہ اقبال)

خدا نے آجتک اس قوم کی حالت نہیں بدلی ۔۔۔ نہ ہو خیال جس کو آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

(۲۴) خداوند عالم جو انسان اور سارے جہان کا پیدا کرنے والا ہے غنی بالذات ہے (یعنی کسی کی وجہ سے غنی نہیں ہے) تمام جہات سے بسیط ہے (یعنی کسی اعتبار سے بھی مرکب نہیں ہے) کامل مطلق ہے، وہ حالتِ منتظرہ نہیں رکھتا، اس میں حرکت اور تکامل محال ہے، اسکی صفات اس

کی عین ذات ہیں، دنیا ساری کی ساری اسی کی بنائی ہوئی ہے، ساری سطح زمین اسی کے ارادہ و مشیت کی مظہر ہے، اس کے ارادے کا کوئی مقابل نہیں ہے ہر ارادہ اور مشیت اس کے ارادہ کے تابع ہے برابر نہیں۔

(۲۵) اس لحاظ سے کہ دنیا کا صدور ایک مبدء سے ہوا ہے اور وہ ایک متناسب و ہم آہنگ رفتار میں اسی کی طرف واپس جائے گی اور اس بنا پر کہ ایک مدبر و باشعور قوت کی تدبیر کے تحت اپنی حرکت اور رفتار کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ ایک قسم کی وحدت سے بہرہ مند ہے ایسی وحدت جو زندہ موجود جسم کی وحدت سے مشابہ ہے۔

(ج) آئیڈیالوجی کے لحاظ سے اسلامی مشخصات

اسلام کے امتیازی خصوصیات کا بیان آئیڈیالوجی کے لحاظ سے علی الخصوص آئیڈیالوجی کی وسعت اور پھیلاؤ کے لحاظ سے ، خواہ وہ کلی مشخصات کے لحاظ سے ہو یا اس آئیڈیالوجی کے ہر شاخ کی خصوصیات کے لحاظ سے ہو، بہت مشکل ہے، پھر بھی ہم اس مقولہ کی بنا پر کہ مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ، جس کا تفصیلی بیان ممکن نہ ہو تو مقدور بھر کو ترک نہیں کرنا چاہیے، جو کچھ اس موقع پر فعلاً ہمارے لیے ممکن ہے اس کی ایک فہرست پیش کرتے ہیں۔

۱۔ ہمہ جہتی اور تکامل دوسرے ادیان کے مقابلے میں اسلام کے امتیازات میں سے ہے۔ دوسرے الفاظ میں دینِ خدا کی ابتدائی صورتوں کی بہ نسبت اس کی مکمل و جامع شکل کے تمام خصوصیات میں سے اس کی جامعیت اور ہمہ جہتی ہے۔ اسلام کے چار مآخذ قرآن، سنّت، اجماع اور عقل اس امر کے لیے کافی ہیں کہ علماء امّت ہر موضوع کے بارے میں اسلامی نظریہ کو معلوم کر سکیں۔ علماء اسلام کسی موضوع کو بلا حکم نہیں مانتے بلکہ ہر موضوع اور ہر فعل کے لیے احکام

وضع ہوتے ہیں۔

۲۔ اجتہاد پذیری : اسلامی کلیات اس طرح سے منظم ہوئے ہیں کہ وہ اجتہاد قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اجتہاد یعنی کلی و ثابت اصول کو جزئی اور بدلتے رہنے والے مسائل و امور پر منطبق کرنا، علاوہ اس روش تنظیم کے جس نے اسلامی کلیات کی روش کو اجتہاد پذیری کی خاصیت دی ہے اسلامی سرچشموں اور منابع کی فہرست میں عقل کی موجودگی نے اجتہاد حقیقی کے کام کو آسان کر دیا ہے۔

۳۔ سہولت و آسانی۔ رسول اکرمؐ کے الفاظ میں اسلام "شریعۃ سمحۃ سہلۃ"[1] ہے ہاتھ پاؤں باندھ دینے والی، مشقت میں ڈالنے والی بے حد پریشان کرنے والی تکالیف شرعیہ عائد نہیں کی گئی ہیں۔" ماجعل علیکم فی الدین من حرج" خدا نے تمہارے لیے دین میں تنگی و دشواری قرار نہیں دی ہے اور اس بنا پر کہ "سمحہ" یعنی آسان ہے جہاں بھی اس تکلیف (حکم شرعی) کا انجام دینا تنگی و دشواری اور شدید زحمت کا باعث ہو وہاں وہ تکلیف ساقط ہو جاتی ہے۔

۴۔ زندگی کی طرف میلان و رغبت۔ اسلام زندگی کی طرف مائل اور راغب کرنے والا دین ہے نہ کہ زندگی سے منھ موڑنے کا باعث اور اسی لیے اس نے رہبانیت (ترک دنیا) سے سختی کیساتھ مقابلہ کیا ہے ارشاد پیغمبرؐ ہے" لا رهبانیة فی الاسلام" اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ پرانے معاشروں میں دو چیزوں میں سے ایک چیز ہمیشہ موجود رہی : یا صرف آخرت کی طرف رغبت اور دنیا سے فرار (یعنی رہبانیت) ، یا صرف دنیا کی طرف رغبت اور آخرت سے گریز یعنی (تمدن، وسعت پسندی کو دنیا پسندی کے دائرہ میں قرار دیا ہے، اسلام کی نظر میں آخرت کا راستہ دنیاوی

[1] "بعثت علی الشریعة السمحة السهلة" یہ حدیث اس عبارت سے معروف و مشہور ہے، لیکن مجھے یاد نہیں ہے کہ میں نے کہیں عین اس عبارت کو دیکھا ہو، کافی ج ۵ ص۴۹۴ میں اسطرح ہے "لم یرسلنی اللہ بالرهبانیة ولکن بعثنی بالحنیفیة السهلة السمحة" اور جامع الصغیر (کتب اہل سنت سے ہے) میں تاریخ خطیب سے منقول اور کنوز الحقائق (کتب اہل سنت سے ہے) میں ترمذی سے منقول اسطرح ہے "بعثت علی الحنیفیة السمحة" (مؤلف (ق۔س)

زندگی کے اور اس کی ذمہ داریوں کے درمیان سے گذرتا ہے۔

۵۔ اجتماعی ہونا۔ اسلامی مقررات واحکام اجتماعی ماہیت رکھتے ہیں، یہاں تک کہ وہ احکام جو زیادہ سے زیادہ فردی ہیں جیسے نماز، روزہ وغیرہ ان میں بھی ایک اجتماعی چاشنی دی گئی ہے اسلام کے بہت سے مقررات و قوانین اجتماعی، سیاسی، اقتصادی، حقوقی اور جزائی اسی خصلت کے حامل ہیں جس طرح سے کہ جہاد، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسلامی اجتماعی ذمہ داری سے تعلق رکھتے ہیں

۶۔ انفرادی حقوق اور آزادی۔ اس کے باوجود کہ اسلام ایک اجتماعی دین ہے اور پورے معاشرہ پر نظر رکھتا ہے اور فرد کو معاشرہ کا ذمہ دار شمار کرتا ہے فرد کی آزادی اور اس کے حقوق سے چشم پوشی نہیں کی ہے اور فرد کو غیر اصل نہیں جانا ہے بلکہ اسلام نے فرد کے لیے سیاسی، اقتصادی، قانونی اور اجتماعی حقوق رکھے ہیں۔

سیاسی لحاظ سے مشورہ اور انتخاب کا حق فرد کو حاصل ہے، اقتصادی لحاظ سے اپنے کام کے ماحصل اور حق المحنت پر مالکیت کا حق، معاوضہ اور مبادلہ کا حق، صدقہ، وقف، ہبہ، اجارہ مزارعہ اور مضاربہ وغیرہ کا حق اپنے جائز ملک میں ہے، قضائی لحاظ سے دعوے دائر کرنے، اپنا حق ثابت کرنے، گواہی دینے کے حقوق دیے گئے ہیں، اجتماعی لحاظ سے کام اور جائے سکونت کے انتخاب کا حق تحصیل علم میں مضمون کے انتخاب وغیرہ کا حق اور عائلی زندگی میں اپنی شریک حیات کے انتخاب کا حق حاصل ہے۔

۷۔ معاشرہ کے حق کا فرد کے حق پر مقدم ہونا۔ جہاں پر جامعہ اور فرد کے حقوق کے درمیان تصادم و تعارض ہو تو وہاں پر جامعہ اور معاشرہ کا حق مقدم سمجھا جائے گا۔ حق عام کو حق خاص پر تقدم ہے ایسے مواقع پر حاکم شرعی فیصلہ کرے گا۔

۸۔ اصل شوریٰ۔ شوریٰ کی اصلیت اجتماعی مسائل میں اسلامی نظریہ کے مطابق ایک معتبر اصل ہے ایسے موقعوں پر جہاں شارع اسلام کی کوئی نص (دلیل قطعی) موجود نہ ہو تو مسلمانوں کو

چاہیے کہ اجتماعی غور و فکر اور باہمی مشورے سے عمل کریں۔

۹۔ مضر اور نقصان دہ حکم کا نہ ہونا۔ اسلامی قوانین واحکام جو مطلق اور عام ہیں اسی حد تک ان کے عموم اور اطلاق پر عمل جائز ہے۔ جہاں تک کسی ضرر و نقصان کا باعث نہ ہو، قاعدۂ ضرر ایک کلی قاعدہ ہے جو ہر قانون کے اجراء کے موقع پر "ویٹو" یعنی "تنسیخ" کا حق رکھتا ہے جب کہ وہ اجراء ضرر و نقصان کا باعث ہو

۱۰۔ اصالت فائدہ۔ اسلام کی نظر میں ہر کام خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی سب سے پہلے اس کے فائدے اور مفید نتیجہ کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ جس کام سے کوئی فائدہ برآمد نہ ہو اسلام کی نظر میں "لغو" اور مہمل سمجھا جاتا ہے اور ممنوع ہے۔" والذین ھم عن اللغو معرضون" [۱]

۱۱۔ آپس میں تبادلہ کی جانے والی چیزوں میں اصالت خیر۔ مال و دولت کی گردش اور اس کے نقل و انتقال، ہیر پھیر کو ہر طرح کی بے ہودگی اور بدعنوانی سے پاک و صاف ہونا چاہیے۔ ہر نقل و انتقال کے مقابل میں کوئی مادی یا معنوی خیر و بھلائی ملحوظ نظر ہونی چاہیے۔ ورنہ مال کی یہ گردش "رولنگ" غلط اور باطل ہوگی جو ممنوع ہے۔ " ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل" [۲]، جوے وغیرہ کے ذریعہ مال کا نقل و انتقال باطل طریقہ سے مال کمانے کا مصداق ہے اور حرام ہے۔

۱۲۔ سرمایہ جب گردش یا نقصان یا تباہی کی صورت سے خارج ہو کر ضمانت و قرض کی صورت اختیار کرلے اس وقت عقیم (فائدے سے خالی) ہوگا اور اسلامی آئیڈیالوجی کے لحاظ سے اس کا کوئی جائز فائدہ نہ ہوگا اور جو زیادتی بھی اصل سرمایہ پر لی جائے سود اور حرام ہے۔

۱۳۔ ہر مالی تبادلہ اور سرمایہ کی گردش طرفین کی پوری واقفیت و آگاہی سے ہونی چاہیے۔ اور ضروری معلومات پہلے ہی حاصل کرلینی چاہیے ورنہ معاملہ جاہلانہ آزمائشی دھوکہ اور باطل سمجھا جائے گا "نھی النبی عن الغرر" (۳) (غَرَر۔ اپنے کو معرضِ ہلاکت میں ڈالنا خدعۃ، دھوکہ، فریب)

[۱]: سورۂ مومنون ۳۔ [۲]: بقرہ ۱۸۸ [۳] جو چیز نہی نبوی کی عبارت میں ہے وہ بیع غرری ہے، لیکن اجتہادی موازین اس خصوصیت کے لغو ہونے کا حکم دیتے ہیں اور عام طور پر ہر فریب کاری کو ممنوع گردانتے ہیں۔ مؤلف (ق س)

۱۴۔ خلافِ عقل امور سے مبارزہ ۔ اسلام عقل کو قابلِ احترام چیز اور اسے خدا کا باطنی رسول سمجھتا ہے اصولِ دین عقلی اور منطقی دلیل کے بغیر قابل قبول نہیں ہے، فروع دین میں بھی عقل، اجتہاد کے سرچشموں میں سے ایک ہے، اسلام عقل کو ایک قسم کی طہارت اور زوالِ عقل کو ایک طرح کا حدث تصور کرتا ہے لہٰذا جنون یا مستی کا طاری ہونا بھی پیشاب کرنے یا ہو جانے کے مانند ہے اور وضو کو باطل کر دیتا ہے، اسلام ہر طرح کی مستی اور نشے کا مخالف ہے اور مطلقاً تمام نشہ لانے والی چیزوں کے استعمال کو حرام قرار دیتا ہے، کیونکہ وہ اس چیز کا مخالف ہے جو عقل کی مخالف ہو اور یہ مخالفت اس دین کے متن کا جزء ہے۔

۱۵۔ خلافِ ارادہ امور سے مبارزہ ۔ جس طرح عقل محترم ہے اور اسلامی تعلیمات میں بہت سے احکام عقل کی حفاظت و نگہبانی کے لیے ہیں، اسی طرح ارادہ بھی جو عقل کی قوتِ مجریہ ہے محترم ہے اس لحاظ سے ارادہ (خیر) سے روکنے اور باز رکھنے والی چیزیں ۔ جو زبانِ اسلام میں "لہو" و لعب کہلاتی ہیں ۔ بھی حرام و ممنوع ہیں۔

۱۶۔ کام اور مشغلہ ۔ اسلام بیکاری و کاہلی کا دشمن ہے ۔ اس لحاظ سے کہ انسان جامعہ اور معاشرہ سے استفادہ کرتا ہے ۔ کام فرد اور جامعہ دونوں کی اصلاح کرنے کا بہترین عامل اور سبب ہے اور بیکاری سب سے بڑا عامل تباہی و فساد ہے اس لیے انسان کو مفید کام انجام دینا چاہیے ۔ اسلام طفیلی ہونے اور جامعہ کے اوپر ایک بوجھ ہونے کو بہر صورت موردِ لعن وطعن قرار دیتا ہے۔ "ملعون من القیٰ کلّہ علی الناس" (۱) قابلِ لعنت ہے وہ شخص جو اپنا بوجھ لوگوں پر ڈال دے

۱۷۔ کار و کوشش ایک کوئی کام اور پیشہ ۔ علاوہ اس کے کہ ایک خدائی حکم ہے ایک مقدس اور پاکیزہ عمل اور اللہ کو محبوب و پسند امر ہے ۔ جہاد کے مانند ہے "ان اللّٰہ یحب المومن المحترف" (۲) خداوند عالم صاحب حرفۃ و صنعت مومن کو دوست رکھتا ہے "الکادّ لعیالہ کالمجاھد فی سبیل اللّٰہ" جو شخص اپنے عیال کے لیے آذوقہ مہیا کرنے کی غرض سے اپنے کو رنج و تکلیف میں ڈالے

۱ ؛ وسائل ۔ ۲ ؛

وہ اس شخص کے مانند ہے جو راہِ خدا میں جہاد کرتا ہے۔

۱۸۔ استثمار کی ممانعت۔ اسلام استثمار یعنی دوسروں کے کام سے بلاعوض یا غیر متناسب معاوضہ کو خواہ وہ کسی شکل اور کسی تدبیر سے ہو ناجائز اور ممنوع قرار دیتا ہے، کسی کام کے غیر مشروع ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ یہ ثابت ہو جائے کہ وہ استثماری ماہیت رکھتا ہے۔

۱۹۔ اسراف و تبذیر (فضول خرچی) لوگ اپنے اموال کے مالک ہیں اور اس پر اپنا پورا تسلّط رکھتے ہیں (۳) لیکن یہ تسلّط اس معنی میں ہے کہ اسلام نے جو حدود معین کیے ہیں ان کے دائرے میں ہو۔ نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ۔ مال کا ضائع کرنا ہر شکل میں اور ہر صورت سے خواہ وہ دور پھینک دینے کی صورت میں ہو یا تباہ کن تجملات و زیب و زینت کی چیزوں پر صرف کرنے کی شکل میں ہو، جس کو زبانِ اسلام میں "اسراف" اور "تبذیر" سے تعبیر کیا گیا ہے ممنوع اور حرام ہے۔

۲۰۔ زندگی میں توسعہ و کشائش۔ ضروریات زندگی کی چیزوں (خوراک، لباس اور مکان) میں اہل و عیال کے آرام و آسائش کی غرض سے کشائش دینا بشرطیکہ اس سے کسی کے حق کی تضییع اور کسی کی حق تلفی یا اسراف و تبذیر اور فضول خرچی کی حد میں داخل نہ ہو جائے یا کسی فریضہ اور تکلیف شرعی کے چھوٹ جانے کا سبب نہ بن جائے، جائز بلکہ لائقِ مدح فعل ہے جسکی ترغیب بھی دی گئی ہے

۲۱۔ رشوت، اسلام میں رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں شدّت سے آتشِ جہنم کے محکوم و مستحق بتائے گئے ہیں "الراشی والمرتشی کلاھما فی النّار" اور جو پیسے اس طریقہ سے حاصل ہوتے ہیں وہ ناجائز و حرام ہیں۔

۲۲۔ احتکار۔ عمومی اشیاء ضرورت (خصوصاً اشیائے خوردنی) کو جمع کر کے چھپا لینا تاکہ ان کی قیمتوں میں اضافہ ہو جائے یہ عمل اور ان اشیاء کا مہنگا بیچنا ممنوع و حرام ہے۔ حاکم شرعی مالک کی خواہش اور مرضی کے خلاف ان جمع شدہ اشیاء کو بازار میں لائے گا اور انھیں عادلانہ نرخ

۳ : الناس مسلّطون علی اموالھم۔

پر فروخت کرائے گا۔

۲۲ درآمد مصلحت کی بنیاد پر ہونا نہ کہ " مانگ" اور مطلوبیت کی بنیاد پر۔ عام طور پر چیزوں کی قدر و قیمت اور مالیت کو صارفین کی خواہشات اور تقاضا معاشرہ میں مضمر جانتے ہیں اور کسی کام کے مشروع ہونے کے لیے اس کام کے عوام کی عمومی خواہش کے مطابق ہونے کو کافی سمجھتے ہیں، لیکن اسلام کسی چیز کی مالی قدر و قیمت کے لیے عمومی مطلوبیت اور خواہشات کو اسی طرح افراد کے کسی کام کو مشروع سمجھنے کو کافی نہیں جانتا، بلکہ معاشرہ کی مصلحت عمومی مطلوبیت اور ضرورت کے علاوہ اور کام کی جوازیت کو مالیت کے لیے لازمی شرط قرار دیتا ہے۔

یعنی اسلام صرف لوگوں کی خواہشوں اور رغبتوں کو منفعت کے مشروع ہونے کا سرچشمہ نہیں شمار کرتا بلکہ خواہشات و میلانات کے علاوہ مصلحت معاشرہ سے موافقت کو بھی شرط قرار دیتا ہے، دوسرے لفظوں میں اسلام بازار میں کسی چیز کی صرف " مانگ" اور تقاضا کو اس چیز کے بازار میں لائے جانے کی مشروعیت و جواز کے لیے کافی نہیں سمجھتا (جب تک کہ مصلحت اس کی متقاضی نہ ہو) اسی لحاظ سے اسلام میں چند کاموں اور کسب کے طریقوں کو " مکاسب محرّمہ" کہا گیا ہے۔ مکاسب محرّمہ (یعنی کمانے کے حرام طریقے) چند قسم کے ہیں۔

(الف) چیزوں کے ایسے باہمی تبادلے جو اغراء بالجہل (جہالت پر آمادہ کرنے) اور نادانیوں کے قائم کرنے کے موجب ہوں۔ ایسی چیزیں جو لوگوں کی عملاً جہالت اور فکری و اعتقادی روگردانی کی طرف راغب کرنے اور شوق دلانے کا سبب ہوتی ہیں، حرام ہیں اگرچہ اس کی " مانگ" کافی مقدار میں ہو، اس لحاظ سے صنم فروشی (بتوں کا بیچنا) صلیب کا بیچنا، تدلیس ماشطہ (خواستگاروں کو دھوکہ دینے کے لیے عورت کی آرائش کرنا اور اس آرائش کے ذریعہ عورت کے عیب یا عیوب چھپانا) کسی ایسے شخص کی مدح کرنا جو اس مدح کا مستحق نہ ہو، کہانت اور غیب گوئی یہ سب امور حرام ہیں اور ان طریقوں سے مال وصول کرنا بھی ممنوع و حرام ہے۔

(ب) ان چیزوں کا باہمی تبادلہ جو گمراہ کرنے اور غفلت میں مبتلا کرنے کے باعث ہیں۔ گمراہ کن کتابوں اور فلموں کی خرید و فروخت، اور ہر وہ کام جو کسی طرح سے بھی معاشرہ اور جامعہ کی ضلالت و گمراہی کا موجب ہو۔ غیر مشروع اور حرام ہے۔

(ج) وہ کام جو دشمن کی تقویت کا موجب ہو، ان تمام طریقوں میں سے، جو دشمن کی بنیاد کے مضبوط ہونے کے موجب ہوں خواہ فوجی اعتبار سے ہو یا اقتصادی، ثقافتی یا اطلاعاتی ہو اور اسلامی محاذ کی کمزوری کا سبب ہوں، خواہ اسلحہ فروشی کی صورت میں ہو یا ایسی دوسری چیزوں کے فروخت کی شکل میں جن کی احتیاج ہو اور جو عملاً مذکورہ امور کا سبب ہوں۔ (ان میں سے) کسی ایک طریقہ سے بھی رقم حاصل کرنا حرام اور ممنوع ہے، قلمی کتابوں کے نایاب نسخوں کا بیچنا بھی انھیں چیزوں میں شامل ہے۔

(د) ایسے امور کے ذریعہ مال حاصل کرنا جو فرد یا جامعہ کے لیے تباہ کن اور نقصان پہنچانے والے ہوں۔ مثلاً شراب فروشی، آلات قمار (جوا کھیلنے کے آلات، تاش، شطرنج کے مہرے وغیرہ) کا بیچنا، اسی طرح نجس العین چیزوں کا بیچنا، ناقص اور ملاوٹ کی ہوئی چیزیں اسی زمرہ میں شامل ہیں (ان سب طریقوں سے) مال حاصل کرنا، جوا کھیلنا، قیادت (یعنی امر حرام کی طرف دوسرے کو مائل کرنا اور لے جانا) کسی مومن کی ہجو، ظالموں کی مدد کرنا اور ان کی نوکری اور ملازمت وغیرہ (یہ امور حرام و ممنوع ہیں)

البتہ کسب حرام کی دوسری قسم بھی ہے جو کام کے خلاف مصلحت ہونے کی دلیل کی بنا پر نہیں بلکہ اس کے مبادلہ سے بالا تر ہونے کی وجہ سے حرام ہے، بہت سے کام بزرگی و پاکیزگی کی ایسی حدیں ہیں کہ ان کا عوض قرار دینا انکی حیثیت و عظمت و حرمت کے خلاف ہے جیسے فتوے دینے، شرعی فیصلہ کرنے، اصول و فروع دین کی تعلیم دینے، وعظ و نصیحت اور اسی قسم کے امور پر اجرت لینا، ممکن ہے طبابت بھی اسی میں شامل ہو۔

مذکورہ کام اور مشغلے خاص قداست و شرافت کی بنا پر مبادلہ سے بالاتر ہیں اور اس امر سے بلند تر ہیں کہ آمدنی کا ذریعہ اور دولت جمع کرنے کا وسیلہ بنیں۔ یہ سب کام واجبات کا ایک سلسلہ ہیں جنہیں بلا عوض انجام پانا چاہیے، البتہ مسلمانوں کا بیت المال ان مقدس کاموں کے انجام دینے والوں کے ضروریات زندگی کے اخراجات کا ذمہ دار ہوگا۔

۲۴۔ حقوق سے دفاع کی پاکیزگی۔ حقوق کی حفاظت اور اس سے دفاع کرنا۔ خواہ وہ حقوق فردی ہوں یا اجتماعی اور زیادتی و زبردستی کرنے والے سے مبارزہ و مقابلہ واجب اور مقدس کام ہے "لا یحب اللہ الجہر بالسوء من القول الا من ظلم" (۱) "خداوند عالم اعلانیہ بدگوئی (رسوا کرنے) کو پسند نہیں کرتا۔ سوائے اس کے جو ستایا گیا ہو"۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ "افضل الجہاد کلمۃ عدل عند امام جائر" "بہترین جہاد ظالم و جابر پیشوا کے سامنے عدالت و انصاف کی بات کہنا ہے"۔ جناب امیر المومنینؑ رسول اکرمؐ سے نقل فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے کئی موقعوں پر یہ جملے ارشاد فرمائے ہیں۔ فرماتے ہیں "لن تقدس امۃ حتی یوخذ للضعیف حقہ من القوی غیر متتعتع" (۲) کوئی قوم اور ملت بزرگی و پاکیزگی (تعریف و تحسین کی قابلیت) نہیں حاصل کرتی یہاں تک کہ اس مرحلہ پر پہنچ جائے کہ کمزور اپنا حق بلا خوف اور بلا جھجک طاقتور سے لے۔

۲۵۔ اصلاح کی کوشش اور فساد و خرابی کے مقابلہ میں دائمی مبارزہ اسلام میں اچھائیوں کا حکم دینا اور اس طرف متوجہ رکھنا اور برائیوں سے روکنا وہ اصل اور وہ فریضہ ہے جو امام باقر علیہ السلام کے مبارک الفاظ میں "تمام فرائض اسلامی کا پایہ اور ستون ہے" یہ اصل مسلمان کو دائمی فکری انقلاب سے اصلاح معاشرہ کی جاودانی کوشش اور تمام خرابیوں اور تباہ کاریوں سے مسلسل جنگ و مبارزہ کی جانب میں رکھتی ہے "کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف و تنہون عن المنکر" (۳) "تم بہترین گروہ ہو جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہے تم نیکیوں کا حکم دیتے ہو اور برائیوں سے منع کرتے ہو"۔

۱۔ سورۂ نساء / ۱۴۸
۲۔ نہج البلاغہ، عہد نامہ جو جناب مالک اشتر کو دیا گیا
۳۔ آل عمران / ۱۱۰

جناب رسول اکرمؐ فرماتے ہیں : لتامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر او لیسلطن اللہ شرارکم فیدعو اخیارکم فلا یستجاب لھم۔(۱) چاہیے کہ تم لوگ امر بالمعروف کرو اور برائیوں سے روکو ورنہ خداوند عالم تمہارے بروں کو مسلط کر دے گا، پھر تمہارے نیک لوگ دعا کریں گے تو مستجاب نہیں ہوگی۔

۲۶۔ توحید : اسلام ہر چیز سے زیادہ دینِ توحید ہے، توحید کے بارے میں کسی خراش و خرابی کو چاہے وہ توحید نظری میں ہو چاہے توحید عملی میں قبول نہیں کرتا، اسلامی افکار، رفتار اور کردار سب خدا سے شروع ہوتے ہیں اور خدا ہی پر ختم ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہر قسم کی ثنویت (دوئی) اور تثلیث یا کسی زیادتی کو جو اس اصل کو مخدوش و مجروح کرتی ہو اسلام اسے سختی سے رد کرتا ہے، جیسے (معاذ اللہ) خدا اور شیطان کی ثنویت' یا خدا اور انسان کی دوئی یا خدا اور مخلوق خدا کی دوئی۔

ہر کام چاہیے کہ خدا کے نام سے، خدائی فکر و اندیشہ کے ساتھ، خدا کی طرف اور خدا سے تقرّب و نزدیکی حاصل کرنے کے لیے شروع ہو اور انجام کو پہنچے اور جو کام اس کے علاوہ ہوگا وہ اسلامی کام نہیں ہے۔ اسلام میں تمام راہیں توحید پر ختم ہوتی ہیں۔ اخلاق اسلامی کا سرچشمہ توحید ہے اور یہ توحید ہی پر ختم ہوتا ہے۔ اسلامی تربیت بھی اسیطرح ہے، سیاست اسلامی، اقتصاد اسلامی و اجتماع اسلامی سب اسی طرح (توحید سے وابستہ ہیں) اسلام میں ہر کام خدا کے نام سے اور اسی کی استعانت (نصرت خواہی) سے شروع ہوتا ہے" بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم" اور خدا کے نام اور اس کی حمد پر ختم ہوتا ہے" الحمد للہ رب العالمین" اور خدا کے نام سے اور اسی پر اعتماد و بھروسہ سے (ہر کام) جاری ہوتا ہے" توکلت علی اللہ، وعلی اللہ فلیتوکل المومنون" ایک واقعی مسلمان کی توحید ایک خیال اور ایک خشک عقیدہ نہیں ہے۔ جس طرح سے کہ ذات خدا اپنے مخلوقات سے جدا نہیں ہے بلکہ سب کے ساتھ ہے اور سب پر محیط

ہے۔ ساری چیزیں اسی سے شروع ہوتی ہیں اور اسی پر ختم ہوتی ہیں، اسی طرح توحید کا تصور بھی ایک واقعی موحّد کے از سر تا پا وجود پر محیط ہوتا ہے، اس کے تمام افکار و خیالات اس کی تمام توتوں اور اس کی رفتاروں پر تسلط پیدا کرلیتا ہے اور ان سب کو سمت بتاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک واقعی مسلمان کے کام کی ابتدا، انتہا اور وسط خدا ہے اور وہ کسی چیز کو خدا کا شریک قرار نہیں دیتا۔

۲۷۔ واسطوں کو لغو قرار دینا، اسلام باوجودیکہ نزولِ فیض میں واسطوں اور ذرائع کو قبول کرتا ہے اور علّت و معلول (سبب و مسبب) کے نظام کو خواہ وہ امور مادّی میں ہو اور چاہے امور معنوی میں ہو۔ حقیقی اور واقعی شمار کرتا ہے (مگر) پرستش، اور عبادت کی منزل میں تمام وسائط و ذرائع کو لغو قرار دیتا ہے، جیسا کہ ہم سب ہی جانتے ہیں کہ تحریف شدہ مذاہب میں فرد (یعنی انسان انفرادی حیثیت سے) خدا سے براہِ راست رابطہ و تعلق کی قدر و قیمت اپنے ہاتھ سے کھو چکا ہے، خدا اور بندہ کے درمیان جدائی فرض کرلی گئی ہے صرف کاہن یا روحانی پیشوا براہِ راست خدا کے ساتھ راز و نیاز کر سکتا ہے اور بس اسی کو حق ہے کہ دوسرے تمام لوگوں کے پیغامات کو خدا تک پہنچائے ــــ اسلام میں یہ کام ایک طرح کا شرک گنا جاتا ہے، قرآن کریم صراحت کے ساتھ کہتا ہے " (اے حبیب) اگر میرے بندے میرے بارے میں تم سے سوال کریں تو کہہ دو! میں نزدیک ہوں، میں دعا کرنے والے کی دعا قبول و مستجاب کرتا ہوں .... (البقرہ-۱۸۶)

۲۸۔ اہلِ توحید کے ساتھ باہمی زندگی کا امکان۔ اسلام کی نظر میں تمام مسلمان اپنے ملک میں دوسرے ادیان کے ماننے والوں اور پیرؤں کے ساتھ جو اصلِ توحید رکھتے ہیں جیسے یہودی، عیسائی اور مجوسی اگرچہ فعلاً وہ توحید سے منحرف ہی ہوں (پھر بھی) چند معیّن شرائط کے ساتھ ان کے ساتھ زندگی گذار سکتے ہیں۔

لیکن اسلامی ملک کے اندر مشرک کے ساتھ زندگی نہیں گذار سکتے، مسلمان لوگ اسلامی

بنا مصلحتوں کی بنیاد پر ممالکِ مشرکین کے ساتھ صلح اور عدم تعرض کی قرارداد منظور کرسکتے ہیں یا کسی خاص مسئلہ پر معاہدہ کرسکتے ہیں۔

۲۹۔ مساوات۔ اسلامی آئیڈیالوجی کے اصول وارکان میں سے ایک اصل مساوات اور عدم تبعیض بھی ہے (یعنی سب برابر ہیں، کسی کو کسی پر فوقیت اور ترجیح نہیں ہے)۔ اسلام کی نظر میں سب انسان جوہر اور ذات کے لحاظ سے برابر ہیں اور لوگ اس اعتبار سے دو یا کئی قسموں پر پیدا نہیں کیے گئے ہیں، رنگ، خون، نسل و قومیت برتری و بلندی کے معیار نہیں ہیں، سیّد قرشی اور سیاہ (کالا) حبشی دونوں برابر ہیں۔ اسلام میں آزادی، جمہوریت اور عدالت انسانوں کی مساوات اور برابری کا ثمرہ ہے۔

اسلامی نظریہ کے مطابق صرف چند محدود و معیّن حالات میں افراد کے بعض حقوق خود انہیں افراد اور جامعہ کی چند مصلحتوں کے پیش نظر موقتاً اور عارضی طور پر سلب ہوتے ہیں، لیکن یہ صورت افراد کے جوہر (ذات)، خون، نسل اور مقام سے کوئی تعلق نہیں رکھتی، غلاموں کی غلامی کا وقتی و عارضی دور جو اسلام کی نظر میں علمی، تعلیمی اور تربیتی مقولہ میں داخل ہے نہ کہ اقتصادی، نفع یابی وغیرہ کے اغراض میں اور وہ دور اسلامی تربیت کے ایک ہال اور پرورش گاہ کی حیثیت رکھتا ہے

۳۰۔ اسلام میں حقوق، تکالیف اور مجازات (بدلے) دوجنبی ہیں، یعنی جس طرح انسانیت میں مرد و زن مشترک ہیں اور نوعی اشتراک رکھتے ہیں، لیکن ان کی جنسیت (یا صنفیت) ان کو خاص فرعی مختص امور میں دو صنفوں کی شکل میں نمایاں کردیتی ہے، حقوق، تکالیف اور مجازات جس حد تک دونوں صنفوں کے درمیان مشترک امور سے متعلق ہیں وہ مشترک اور مساوی حیثیت کے اور ایک جنبی ہیں۔ جیسے تحصیل علم کا حق، حق عبادت و پرستش، ہمسر (زوجہ اور شوہر) کے منتخب کرنے کا حق، مالکیت کا حق، اپنی مملوکہ چیزوں میں تصرف کا حق اور اسی طرح کے امور اور وہ مقامات جو ان دونوں کی فرعی جنسیّت اور مختص امور سے وابستہ ہیں۔ وہاں بھی برابر اور متساوی حالت تو ہوتی ہے لیکن

ایک دوسرے سے مشابہہ اور یکساں صورت کی نہیں ہوتی اور دو جنسی ہوتی ہے۔ (۱)

(۷) پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

پیغمبر اکرم حضرت محمد مصطفےٰ ابن عبداللہ جن پر نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا، ۵۷۰ء میں آپ کی ولادت باسعادت ہوئی اور چالیس سال کی عمر مبارک میں اعلانِ نبوت پر مبعوث ہوئے آپ نے تیرہ سال مکہ میں لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور طرح طرح کی زحمتیں، تکلیفیں اور سخت مصیبتیں برداشت کیں اور اس عرصہ میں ایک خالص اسلامی گروہ کی تربیت فرمائی، اس کے بعد آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور اسی کو اسلام کی تبلیغ کا مرکز قرار دیا، دس سال تک مدینہ میں آزادانہ دعوت و تبلیغ دین فرمائی اور عرب سرکشوں سے مقابلہ کیا اور سب کو مقہور و مغلوب کر دیا، ان دس برسوں میں تمام جزیرۃ العرب مسلمان ہو چکا تھا۔

قرآن مجید کی آیات کریمہ ۲۳ سال کے عرصہ میں حضرتؐ پر نازل ہوئیں۔ تمام مسلمان قرآن مجید کے بارے میں اور حضرت رسول اکرمؐ کی مقدس شخصیت کے بارے میں تعجب خیز و حیرت انگیز عشق و محبت والفت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ رسول اکرمؐ نے گیارہویں ہجری میں یعنی مکہ سے مدینہ ہجرت فرمانے کے گیارھویں سال میں جبکہ آپ کی تبلیغِ رسالت کا تیئسواں (۲۳) اور آپ کی عمر مبارک کا تریسٹھواں (۶۳) سال تھا، دنیا سے رحلت فرمائی، اس حالت میں کہ ایک نو بنیاد اور روحانی نشاط سے سرشار معاشرہ اور ایک اصلاح کن آئیڈیالوجی (نظام حیات اجتماعی) پر ایمان رکھنے والے معاشرے کی۔ جو دنیا بھر کی مسئولیت و ذمہ داری کا احساس رکھتا تھا، مستحکم و مضبوط بنیاد قائم کر دی تھی اور اسے قائم و دائم چھوڑ گئے تھے۔

جس چیز نے اس نو بنیاد معاشرہ کو روحانیت، اتحاد اور نشاط بخشی تھی وہ دو چیزیں تھیں

لے: ملاحظہ فرمائیں "نظام حقوق زن در اسلام" از مولف (ق۔س)

(۱) قرآن کریم جس کی ہمیشہ تلاوت ہوتی تھی جو الہام بخشنے والی ہوتی تھی۔ اور (۲) دوسری چیز رسول اکرمؐ کی عظیم شخصیت تھی جو دلوں کو اپنی طرف کھینچتی اور نگاہوں کو شوق دیدار عطا کرتی تھی۔ یہاں حضور اکرمؐ کی مقدس و باعظمت شخصیت پر مختصر طور پر بحث کرتے ہیں۔

حضورؐ کے بچپن کا دور : ابھی رسول اکرمؐ رحم مادر ہی میں تھے کہ آپ کے پدر بزرگوار کا شام کے ایک تجارتی سفر کے دوران مدینہ کے قریب انتقال ہوگیا، آپ کے دادا جناب عبدالمطّلب نے آپ کی تربیت و کفالت کو اپنے ذمہ لیا۔ بچپن ہی سے بزرگی اور عام لوگوں سے بلند تر و بالا تر ہونے کے آثار آپ کے چہرۂ مبارک اور رفتار و گفتار سے ظاہر ہوتے تھے، جناب عبدالمطّلب نے اپنی فراست سے اس بات کو سمجھ لیا تھا کہ آپ کا یہ پوتا ایک روشن و تابندہ درخشاں مستقبل کا حامل ہے۔

آپ ابھی آٹھ سال کے تھے کہ آپ کے دادا کا بھی انتقال ہوگیا اور انکی وصیت کے مطابق آپ کے محترم چچا جناب ابوطالب نے آپ کی کفالت کی ذمہ داری قبول کی، جناب ابو طالب بھی اس بچے (رسول اکرمؐ) کی عجیب رفتار سے جو عام بچوں سے بالکل مشابہت نہیں رکھتی تھی تعجب و حیرت میں رہتے تھے۔ کبھی یہ نہیں دیکھا گیا کہ آپ نے اپنے ہمسن و ہم عمر بچوں کی طرح غذا کے سلسلہ میں کبھی حرص کا اظہار کیا ہو۔ تھوڑے سے کھانے پر اکتفا فرماتے، زیادہ روی سے پرہیز کرتے تھے۔ (۱)

اپنے ہم عمر بچوں کے برخلاف اور اس زمانہ کی عادت و تربیت کے برخلاف آپ اپنے بالوں کو درست اور اپنے سر اور چہرۂ مبارک کو صاف و شفاف رکھتے تھے۔ جناب ابوطالب نے ایک روز حضرت سے خواہش کی کہ آپ ان کے سامنے اپنے لباس اتار کر بستر پر آرام کریں

لے : رسول اکرمؐ کی سیرت، خلق اور خصلت کا جو خلاصہ ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں وہ خاص کر علامۂ بزرگ معاصر آقائے حاجی سید ابوالفضل مجتہد زنجانی کے مقالہ "محمدؐ خاتم پیغمبران" جلد اوّل (جو مؤسسہ اسلامی حسینیہ ارشاد سے شائع ہوا ہے) سے استفادہ کیا گیا ہے بقول قائل

کے لیے، جائیں تو آپ کو یہ خواہش ناگوار گذری اور چونکہ آپ اپنے چچا کے حکم سے سرتابی نہیں کرنا چاہتے تھے لہٰذا اپنے چچا سے کہا کہ آپ اپنا منہ پھیر لیں تاکہ میں اپنا لباس اتار سکوں، ابو طالب بچہ کی اس بات سے بہت متعجب ہوئے کیونکہ عرب میں اس وقت نچے تو نچے بڑی عمر والے مرد بھی اپنے پورے جسم کو (لوگوں کے سامنے) برہنہ کرنے سے کوئی پرہیز نہیں کرتے تھے، جناب ابو طالب کہتے ہیں کہ میں نے آپ سے کبھی جھوٹ نہیں سنا، بے ہودہ کام کرتے اور بے جا ہنستے ہوئے کبھی نہیں دیکھا، بچوں کے کھیل کود کی طرف کبھی رغبت نہیں فرماتے تھے، خلوت نشینی اور تنہائی کو پسند کرتے تھے اور ہر حالت میں منکسر و متواضع رہتے تھے۔

کاہلی اور بیکاری سے نفرت : آنحضرتؐ کاہلی اور بیکاری سے سخت نفرت کرتے تھے اور فرماتے تھے :

خدایا سستی، کاہلی، بیکاری، عاجزی اور بدحالی سے تیری پناہ چاہتا ہوں" مسلمانوں کو کام کرنے کا شوق دلاتے تھے اور فرماتے تھے "عبادت کے ستر (۷۰) حصے ہیں اور اس کا بہترین حصہ حلال روزی کمانا ہے۔"

امانت : بعثت سے پہلے جناب خدیجہ کے لیے جو بعد میں آپ کی زوجہ محترمہ ہوئیں شام کا ایک تجارتی سفر فرمایا، اس سفر میں آپ کی لیاقت و استعداد اور امانت و ایمانداری زیادہ سے زیادہ ظاہر ہوئی، آپ نے اپنی دیانت و امانت داری میں لوگوں کے درمیان اس قدر شہرت حاصل فرمائی تھی کہ لوگوں نے آپ کا لقب ہی محمدؐ "امین" قرار دے دیا تھا، اور اپنی امانتیں حضرت کے سپرد کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ بعثت کے بعد بھی قریش کے لوگ باوجود اس عداوت و دشمنی کے جو آپ سے رکھنے لگے تھے، اپنی امانتیں حضرت

ہی کے سپرد کرتے تھے، اسی وجہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرتے وقت حضرت علی علیہ السلام کو اپنے بعد چند روز کے لیے مکّہ میں چھوڑا تھا تاکہ ساری امانتوں کو ان کے اصلی مالکوں کے حوالہ کریں۔

ظلم سے مقابلہ : زمانہ جاہلیت میں (اعلان رسالت سے قبل) ایک ایسے گروہ کے ساتھ جو خود بھی طاقتور ظالموں کے ظلم وستم کے شکار تھے، مظلوموں اور کمزوروں کی حمایت اور ظالموں سے مقابلہ و مبارزہ کا معاہدہ فرمایا تھا جو عبداللہ بن جدعان کے گھر میں (جو مکّہ کی اہم شخصیتوں میں سے تھا) منعقد ہوا تھا اور "حلف الفضول" کے نام سے مشہور ہے، آپ اپنے دورِ رسالت میں بھی اس معاہدہ کو یاد فرمایا کرتے اور فرماتے تھے کہ "میں راضی نہیں ہوں کہ وہ معاہدہ ٹوٹے اور اب بھی حاضر ہوں کہ ایسے معاہدوں میں شرکت کروں"۔

عائلی اخلاق : آپ خانوادہ میں مہربان تھے، اپنی ازواج کے ساتھ کسی قسم کی سختی نہیں کرتے تھے اور یہ بات مکّہ والوں کے خلق اور خصلت کے برخلاف تھی، اپنی بعض ازواج کی بدزبانی کو برداشت کرتے تھے یہاں تک کہ دوسرے (جاننے اور سننے والے) آپ کے اس تحمل و برداشت سے رنجیدہ ہوتے تھے، آپ لوگوں کو عورتوں کے ساتھ اچھی معاشرت کی وصیت اور تاکید فرمایا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ "تمام لوگ اچھی اور بری خصلتوں کے حامل ہوتے ہیں، لہٰذا مرد کو یہ نہیں چاہیے کہ اپنی بیوی کے صرف ناپسندیدہ ہی پہلو پر نظر رکھے اور اپنی بیوی کو چھوڑ دے، کیونکہ اگر اس کی ایک خصلت سے اسے رنج پہنچتا ہے تو اس کی دوسری خصلت مرد کی خوشنودی کا باعث بھی ہوتی ہے اور ان دونوں خصلتوں کو ساتھ ساتھ نظر میں رکھنا چاہیے"۔ آپ اپنے فرزندوں اور نواسوں پر حد سے زیادہ شفیق و مہربان تھے، ان سے محبت کرتے تھے، اپنی آغوش میں انھیں بٹھاتے

تھے، انھیں اپنے کاندھوں پر سوار کرتے تھے، ان کا بوسہ لیتے تھے، یہ سب باتیں اس زمانہ کی رائج خصلتوں اور عادتوں کے برخلاف تھیں، ایک روز مدینہ کے شرفا میں سے ایک شخص کی موجودگی میں آپ اپنے ایک نواسے (جناب امام حسن مجتبیٰ علیہ السّلام) کا بوسہ لے رہے تھے، اس شخص نے کہا کہ میرے دو بیٹے ہیں، میں نے آج تک ان میں سے کسی ایک کا بوسہ نہیں لیا ہے، آپ نے فرمایا "مَنْ لا یَرْحَم لا یُرْحَم" جو شخص مہربانی نہیں کرتا، خدا کی رحمت و مہربانی اس کے شاملِ حال نہیں ہوتی۔

مسلمانوں کے بچوں کے ساتھ بھی آپ مہربانی فرماتے تھے، ان کو اپنے زانوئے مبارک پر بٹھا کر ان کے سروں پر دستِ شفقت پھیرتے تھے، کبھی کبھی مائیں اپنے چھوٹے بچوں کو حضرتؐ کو دے دیتی تھیں کہ حضرت ان کے واسطے دعا فرمائیں، کبھی ایسا بھی اتفاقاً ہو جاتا تھا کہ وہ بچے آپ کے لباس پر پیشاب کر دیتے اور اس وجہ سے مائیں پریشان اور شرمندہ ہو جایا کرتی تھیں اور چاہتی تھیں کہ بچہ کے پیشاب جاری رہنے کو روک دیں، تو حضرت انھیں اس کام سے سختی کے ساتھ منع فرماتے کہ بچہ کے پیشاب کو جاری ہونے سے (درمیان میں) نہ روکو اور یہ امر کہ میرا کپڑا نجس ہوتا ہے، کوئی بات نہیں میں اسے پاک کرلوں گا۔

غلاموں کے ساتھ

غلاموں کے ساتھ: آنحضرتؐ غلاموں پر حد سے زیادہ مہربان تھے، آپ لوگوں سے فرماتے تھے کہ "یہ سب تمہارے بھائی ہیں، جو غذا تم کھاتے ہو وہی غذا انھیں بھی کھلاؤ اور جو کپڑا تم پہنتے ہو وہی کپڑا انھیں بھی پہناؤ، طاقت فرسا اور مشکل کام کا بوجھ ان پر نہ ڈالو، خود تم بھی کاموں میں ان کی مدد کیا کرو،" حضرتؐ فرماتے تھے کہ "ان کو "غلام" اور "کنیز" (جس سے ان کی مملوکیت کا اظہار ہوتا ہے) کہہ کر نہ بلایا کرو، کیونکہ ہم سب خدا کے مملوک اور بندے ہیں اور مالکِ حقیقی خدا ہے۔ بلکہ ان کو لفظ "فتیٰ" (جوان مرد)

یا " فتاۃ" (جوان عورت) کے لفظ سے پکارا کرو، اسلامی شریعت میں غلاموں اور کنیزوں کی آزادی کے لیے وہ تمام ممکن سہولتیں اور آسانیاں فراہم کی گئی ہیں جن کے نتیجہ میں ان کو مکمل آزادی نصیب ہو، آپ "نخّاسی" یعنی بردہ فروشی کو سب مشغلوں میں بدترین مشغلہ سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ "خدا کے نزدیک بدترین انسان آدمیوں کے بیچنے والے ہیں۔

صفائی و پاکیزگی اور خوشبو : صفائی اور خوشبو سے حضرتؐ کو بہت شغف تھا، خود حضرتؐ ہمیشہ اس کا لحاظ فرماتے تھے اور دوسروں کو بھی حکم دیتے اور تاکید فرماتے تھے، اپنے اصحاب اور پیرودں کو تاکید فرماتے تھے کہ وہ اپنے جسموں اور گھروں کو پاک و صاف اور خوشبودار رکھیں، خصوصاً جمعہ کے دنوں میں ان لوگوں کو آمادہ کرتے تھے کہ وہ غسل کریں اور اپنے کو معطر اور خوشبو کریں۔ تاکہ ان سے بوئے بد نہ محسوس ہو اس کے بعد نماز جمعہ کے لیے مسجد میں حاضر ہوں۔

ملاقات اور معاشرت : رسول اکرمؐ لوگوں کے ساتھ معاشرت اور ملنے جلنے میں بہت مہربان اور کشادہ پیشانی تھے، سلام کرنے میں سب پر یہاں تک کہ بچوں پر بھی سبقت فرماتے تھے، کسی کے سامنے اپنے پاؤں نہیں پھیلاتے تھے، اور کسی کی موجودگی میں ٹیک لگا کر نہیں بیٹھتے تھے، زیادہ تر دو زانو بیٹھتے تھے، مجلسوں میں دائرہ کی شکل میں نشست رکھتے تھے تاکہ مجلس میں بلند و پست جگہ کا وجود ہی نہ ہو اور تمام جگہیں برابر درجہ رکھتی ہوں۔ اپنے اصحاب کے بارے میں دریافت فرماتے رہتے اگر اپنے اصحاب میں سے کسی شخص کو تین روز نہ دیکھتے تو اس کے متعلق خاص طور سے معلومات حاصل فرماتے، اگر وہ مریض ہوتا تو اس کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے اور اگر وہ کسی

پریشانی میں مبتلا ہوتا تو آپ اس کی مدد فرماتے تھے، مجلسوں میں صرف کسی ایک شخص کی طرف نہیں دیکھتے تھے اور خاص طور سے کسی ایک شخص کو خطاب نہیں فرماتے تھے، بلکہ اپنی مقدس نگاہوں کو پورے مجمعے پر رکھتے تھے اور اس امر سے آپ کو سخت نفرت تھی کہ خود آپ بیٹھے رہیں اور دوسرے خدمت کریں (جب کبھی ایسا موقع آتا تو) آپ اپنی جگہ سے فوراً اٹھتے اور دوسروں کے ساتھ کاموں میں شریک ہو جاتے تھے، آپ فرماتے تھے کہ " خداوند عالم کو یہ بات ناپسند ہے کہ وہ بندہ کو اس حالت میں پائے کہ وہ دوسروں کی بہ نسبت اپنے لیے کسی امتیاز کا قائل ہوگیا ہے۔

عین صلابت میں نرمی : آپ اپنے فردی اور شخصی مسائل اور ان امور میں جو خاص آپ کی ذات اقدس سے مربوط و متعلق ہوتے تھے بے حد نرم مزاج ملائم اور درگذر کرنے والے تھے اور آپ کی اپنے مشن میں اتنی جلد کامیابی اور ترقی کے اسباب میں سے ایک یہی عظیم اور تاریخی (رحم دلی و نرم مزاجی کا) برتاؤ ہے۔

لیکن اصولی اور عمومی امور میں، جہاں قانون کی حد شروع ہو جاتی، آپ صلابت اور سختی کا اظہار فرماتے اور پھر اس موقع پر درگذر کی کوئی گنجائش نہیں رہتی تھی، فتح مکہ اور قریش پر فتح و کامیابی حاصل ہو جانے کے بعد آپ نے قریش کی تمام عداوتوں اور ان کی تمام بدسلوکیوں کو جو انھوں نے پورے بیس سال کے عرصہ میں حضرت کے خلاف روا رکھی تھیں ان سب سے آپ نے چشم پوشی فرمائی اور سب کو ایک ساتھ معاف کر دیا اپنے پیارے چچا جناب حمزہ کے قاتل کی توبہ کو قبول کرلیا، لیکن اس فتح مکہ کے موقع پر بنی مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی تھی اور اس کا جرم ثابت ہوگیا، اس عورت کا خاندان قریش کے شرفاء میں سے تھا اور وہ

لوگ حد جاری ہونے کو اپنے لیے توہین کا موجب سمجھتے تھے، چنانچہ ان لوگوں نے رسولِ خدؐا کی خدمت میں بہت دوڑ دھوپ کی اور بہت کوششیں کیں کہ اس عورت پر حد نہ جاری کی جائے اور حضرتؐ اس سے صرفِ نظر اور درگذر فرمائیں، بعض بزرگ صحابہ کو بھی سفارش کے لیے لائے اور ان لوگوں نے سفارش بھی کی، لیکن رسولِ خدؐا کا رنگ غصہ کی وجہ سے سرخ ہو گیا اور آپ نے فرمایا، کیا یہ سفارش کا موقع ہے؟ کیا چند افراد کی خاطر خدائی قانون کو معطل کیا جاسکتا ہے؟ اسی روز آپ نے عصر کے وقت تمام اصحاب کے مجمع میں خطبہ ارشاد فرمایا جس میں کہا:

"پہلی قومیں اور ملّتیں اس وجہ سے تباہ اور ختم ہو گئیں کہ انھوں نے خدا کے قانون کے جاری کرنے میں تبعیض اور جانب داری سے کام لیا، جب کبھی طاقتوروں اور مالداروں میں سے کوئی شخص جرم کا مرتکب ہوتا تو اسے معاف فرما دیتے تھے اور اگر کوئی ضعیف الحال اور کمزور طبقہ کا شخص مرتکب جرم ہوتا تو اسے سزا دیتے تھے، اس خدا کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے "عدل" کے جاری کرنے میں کسی کے بارے میں سستی و کوتاہی نہیں کروں گا خواہ وہ شخص خود میرے نزدیک ترین رشتہ داروں میں سے کیوں نہ ہو

عبادت : رات کے کچھ حصہ میں، کبھی نصف شب، کبھی ایک تہائی اور کبھی دو تہائی رات آپ عبادت میں مشغول رہتے تھے، باوجودیکہ آپ کا پورا دن، خصوصاً مدینہ میں قیام کے زمانہ میں تبلیغی جدوجہد (اور دوسرے دینی کاموں) میں گذر جاتا تھا (پھر بھی آپکی عبادت کے وقت میں کوئی کمی نہیں ہوتی تھی، آپ اپنا کامل آرام و سکون عبادت الٰہی اور اپنے پروردگار کے ساتھ راز و نیاز میں پاتے تھے، آپ کی عبادت بہشت کی طمع یا جہنم کے خوف کی بنا پر نہیں ہوا کرتی تھی بلکہ آپ کی عبادت عاشقانہ اور شکر گذاری کے عنوان سے ہوتی تھی، ایک روز آپ کی ازواج میں سے کسی ایک نے کہا کہ آپ اتنی عبادت کیوں کرتے

ہیں ؟ آپ تو بخشے ہوئے ہیں ، آپ نے جواب دیا کہ " کیا میں ایک شکر گذار بندہ نہ بنوں ؟ آپ روزے بھی بہت رکھتے تھے ، ماہ رمضان کے آخری دہائی میں بالکل آپ مسجد میں معتکف ہو جاتے تھے اور ایکدم سے عبادت میں مشغول رہتے تھے ، لیکن دوسروں سے فرماتے تھے کہ تمہارے لیے یہی کافی ہے کہ تم ہر مہینے میں تین دن روزے رکھ لیا کرو ۔ فرماتے تھے ، بقدر اپنی قوت کے عبادت کیا کرو ، اپنی استعداد سے زیادہ بوجھ اپنے اوپر مت اٹھاؤ ورنہ اس کا نتیجہ الٹا ہوگا ۔ آپ رہبانیت ، گوشہ نشینی اور خلوت میں بیٹھ جانے کو اور اہل و عیال کو ترک کر دینے کے مخالف تھے ، اصحاب میں بعض نے یہی (ترک اہل و عیال کا) مصمم و پختہ ارادہ کر لیا تھا ، وہ ملامت و سرزنش کے مستحق قرار پائے ۔ آپ فرماتے تھے ۔ تمہارا جسم ، تمہارے اہل و عیال ، تمہارے دوست و احباب سب کے حقوق تمہارے اوپر ہیں ، تمہیں ان حقوق کا لحاظ رکھنا چاہیے ۔

تنہائی کی حالت میں عبادت کو طول دیتے تھے ، کبھی کبھی تہجد کی حالت میں گھنٹوں مشغول رہتے تھے ۔ لیکن جماعت میں اختصار کی کوشش فرماتے ، ماموین میں سب سے کمزور شخص کا لحاظ ضروری سمجھتے تھے اور اسی کی وصیت فرماتے تھے ۔

زھد اور زندگی کی سادگی

زہد اور زندگی کی سادگی آپ کی زندگی کے اصول میں تھی ، سادہ غذا نوش فرماتے ، سادہ لباس زیب تن فرماتے ، سادہ روش رکھتے تھے ، آپ کا فرش اکثر چٹائی ہوتی ، زمین پر بیٹھ جاتے تھے ، اپنے ہاتھ سے بکری کا دودھ دوہ لیا کرتے زین و پالان کے بغیر بھی سواری پر سوار ہوتے تھے اور اس امر سے سختی کے ساتھ منع فرماتے کہ کوئی آپ کی سواری کے ساتھ پیادہ چلے ، آپ کی غذا اکثر جو کی روٹی اور خرما ہوا کرتی ، آپ اپنے لباس اور کفش (نعلین) پر خود ہی اپنے ہاتھ سے پیوند لگا لیتے تھے ، اس سادگی کے باوجود فلسفۂ فقر (محتاجی) کے طرفدار نہیں تھے

مال و دولت کو معاشرہ کی ترقی اور جائز کاموں میں خرچ کرنے کو لازم سمجھتے تھے۔ آپؐ فرماتے تھے " نعم المال الصالح للرجل الصالح "، کتنی اچھی ہے وہ دولت جو جائز طریقہ سے حاصل ہو اس آدمی کے لیے جو اس دولت کو رکھنے کے لائق ہو اور جو یہ جانتا ہو کہ اسے کیسے خرچ کرے نیز حضرت فرماتے تھے " نعم العون علی تقوی اللہ الغنیٰ " مال و دولت تقویٰ کے لیے اچھی مدد ہے۔

ارادہ اور پامردی : آپ کا ارادہ، عزم مصمم اور آپ کی استقامت و پامردی بے نظیر تھی اور یہ چیز آپ کے اصحاب میں بھی سرایت کر گئی تھی، آپ کا ۲۳ سالہ دور بعثت و رسالت مکمل عزم و استقامت کا درس ہے۔ آپ اپنی مقدس حیات کی تاریخ میں بارہا ایسے سخت حالات سے دوچار ہوئے کہ تمام امیدیں ہر طرف سے منقطع ہو چکی تھیں، لیکن آپ نے ایک لحظہ کے لیے ہمت ہارنے کا تصور بھی ذہن اقدس میں نہیں آنے دیا، آپ کا ایمان کامل و محکم ایک لمحہ کے لیے بھی نصرت و توفیق الٰہی کیطرف سے متزلزل نہیں ہوا۔

رہبری، انتظام اور مشاورت : باوجودیکہ آپ کا حکم اصحاب کے درمیان فوراً جاری ہوتا تھا اور وہ لوگ بار بار کہتے تھے، کہ جب ہم آپ پر پختہ اور یقینی ایمان رکھتے ہیں تو اگر آپ ہمیں حکم دیں کہ ہم سمندر میں ڈوب جائیں یا اپنے آپ کو آگ میں جلا دیں تو ہم ایسا کریں گے (پھر بھی)، آپ کا طریقہ کار اور آپ کی روش ڈکٹیٹروں کی روش نہیں تھی، جن کاموں میں خدا کی طرف سے کوئی حکم نہیں پہنچا تھا۔ ان کے بارے میں اپنے اصحاب سے مشورہ کرتے

تھے اور ان کے خیالات و آراء کا لحاظ فرماتے تھے اور اس طریقہ سے انکی شخصیتوں کو ابھارتے تھے، جنگ بدر کے موقع پر جنگ کیلئے اقدام کا مسئلہ، اسیطرح لشکر گاہ کے تعین کا مسئلہ، جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک و برتاؤ کا مسئلہ، ان سب مسائل کو آپ نے شوریٰ پر چھوڑ دیا۔ اُحد میں بھی اس مسئلہ کے متعلق کہ لشکر گاہ شہر مدینہ ہی کو بنایا جائے یا اسکے لیے شہر سے باہر کوئی جگہ منتخب کیجائے۔ یہ مسئلہ بھی مشاورت ہی سے طے ہوا، جنگ احزاب اور جنگ تبوک میں بھی اصحاب سے مشورہ کیا۔

پیغمبر اکرمؐ کی نرمی و مہربانی، عفو و درگذر، اپنے اصحاب کے واسطے طلب مغفرت اور امت کے گناہوں کی بخشش کیلئے آپ کی بے چینی و بے تابی، اسیطرح اپنے اصحاب کو سمجھنا اور انھیں وقعت و اہمیت دینا، انکو مشیر قرار دینا اور شخصیت عطا فرمانا، یہ سب چیزیں اپنے اصحاب کے درمیان آپکی عظیم و بے نظیر اثر اندازی اور نفوذ کے اسباب میں سے تھیں۔ قرآن کریم ایک مقام پر اس مطلب کیطرف اشارہ کرتا ہے :

(اے حبیب) " اس مہربانی کیوجہ سے جو خدا نے تمہارے دل میں پیدا کی ہے، تم اپنے اصحاب کے ساتھ نرمی کا برتاؤ رکھتے ہو، اگر تم سخت مزاج اور تند خو ہوتے تو یہ لوگ تم سے دور ہی بھڑکتے اور منتشر ہو جاتے، پس تم انکے ساتھ عفو و درگذر ہی سے کام لو اور انکے لیے طلبِ مغفرت کرتے رہو اور اپنے کاموں میں ان سے مشورہ کر لیا کرو اور جب کسی کام کا پختہ عزم و ارادہ کر لو تو پھر بس خدا پر بھروسہ رکھو" (اور تردد کو اپنی طرف نہ آنے دو) [۱]

نظم و ضبط :

نظم و ضبط و باقاعدگی آپکے تمام کاموں پر حاوی و حاکم تھی آپ اپنے اوقات کو کاموں کے لحاظ سے تقسیم فرمادیا

[۱] : فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظ القلب لا انفضوا من حولك ۔ فاعف عنهم واستغفر لهم وشاورهم في الامر ، فاذا عزمت فتوكل على الله ۔ سورۂ آل عمران/۱۵۹

کرتے تھے (ہر کام کے لیے ایک معیّن وقت اور ہر وقت کیلئے ایک کام اور اسی عمل کی لوگوں کو وصیت بھی فرمایا کرتے۔ آپ کے اصحاب بھی آپکے نفوذ واثر کے تحت خاص طور سے نظم و ضبط کا لحاظ رکھتے تھے، بہت سے منصوبوں کو جنھیں ضروری اور اہم سمجھتے تھے کہ وہ ظاہر نہ ہوں تو انھیں ہرگز ظاہر نہیں فرماتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن اس سے آگاہ ہو جائے، آپ کے اصحاب آپ کے منصوبوں پر بے چون وچرا عمل کرتے تھے۔ مثلاً آپ حکم دیتے کہ تیار ہو جاؤ! کل ہم چلیں گے، تو سب کے سب آپ جسطرف جانے کا حکم دیتے، روانہ ہو جاتے تھے، بغیر اس کے کہ وہ معلوم کریں کہ کہاں جانا ہے (اور کس غرض سے جانا ہے) سفر کے آخری لمحات اور منزلوں میں انھیں معلوم ہوتا کہ آخری منزل کونسی ہے اور مقصد کیا ہے ـــ کبھی چند افراد کو کوچ کا حکم دیتے اور اس گروہ کے سردار کو ایک مہر بند خط عنایت فرماتے اور حکم دیتے کہ جب تم اتنے دن کے بعد فلاں منزل ومقام پر پہنچنا تو خط کو کھولنا اور اس کے مطابق حکم کو جاری کرنا۔

وہ لوگ ایسا ہی کرتے تھے اور اس معیّنہ منزل ومقام پر پہنچنے سے پہلے وہ کچھ نہیں جانتے تھے کہ انتہائی مقصود کہاں ہے اور اس ماموریت وسفر کا مقصد کیا ہے، اس طریقۂ کار سے دشمن اور دشمن کے جاسوسوں کو آخر وقت تک بے خبری میں رکھتے اور کبھی کبھی غفلت کی حالت میں انھیں گرفتار کر لیتے تھے۔

تنقید سننے کی طاقت اور مدّاحی وچاپلوسی سے نفرت

کبھی کبھی رسول اکرمؐ اپنے بعض اصحاب کے اعتراضات سے بھی دوچار ہو جاتے تھے لیکن آپ بغیر اس کے کہ ناراضگی و برہمی کا اظہار فرمائیں انکی رائے کو اپنے منصوبہ کے ساتھ ملا

کر موافق کر لیا کرتے تھے۔ آپ خوشامدی مداحی اور چاپلوسی سننے سے بے زار تھے، فرماتے تھے:

خوشامدیوں اور چاپلوسوں کے مُنہ پر خاک ڈال دو

محکم کاری، کاموں میں استحکام و پائداری کا خیال رکھنے کو پسند فرماتے تھے، آپکی خواہش ہوتی تھی کہ جو کام بھی انجام پائے وہ محکم و مضبوط ہو، یہانتک کہ جب آپ کے مخلص صحابی سعد بن معاذ کا انتقال ہوگیا اور لوگوں نے انکو قبر میں رکھا تو آپ نے اپنے دست مبارک سے قبر کی اینٹوں اور پتھروں کو درست اور محکم کیا اور اسوقت فرمایا:

"میں جانتا ہوں کہ زیادہ زمانہ نہیں گزرے گا کہ یہ خراب و بوسیدہ ہو جائیگی، لیکن خداوند عالم اس بات کو دوست رکھتا اور پسند کرتا ہے کہ بندہ جو کام بھی انجام دے اس کو محکم اور مضبوطی کے ساتھ انجام دے۔"

کمزوریوں سے مقابلہ و مبارزہ ؛ آپؐ لوگوں کے ضعف و کمزوری کے موقعوں اور انکی نادانیوں سے ہرگز کوئی استفادہ نہیں کرتے تھے، بلکہ اسکے برعکس ان مواقع کے خلاف مبارزہ فرماتے تھے اور لوگوں کو ان کی لاعلمی و ناواقفیت سے آگاہ فرماتے تھے، جس روز آپ کے ۱۸ مہینے کے فرزند جناب ابراہیم کا انتقال ہوا۔ اسی دن اتفاق سے آفتاب میں گہن لگا، لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ اس گہن کا سبب وہ مصیبت ہے جو رسول اکرمؐ پر پڑی ہے، لوگوں کے اس جاہلانہ خیال کے مقابل میں آپ خاموش نہیں رہے اور ضعفِ اعتقاد کے اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا " ایہا الناس (اے لوگو!)، چاند اور سورج خدا کی نشانیوں میں سے

دو نشانیاں ہیں، یہ کسی کے مرنے سے متاثر نہیں ہوتیں"۔

قیادت اور رہنمائی کے تمام شرائط :

رہبری کے شرائط، تشخیص اور تفہیم

قاطع تیقنِ کامل ، دلیری اور چالاکی، پیشقدمی کرنا اور محتمل و ممکن عواقب و انجام سے خوف رہنا، پیش بینی اور دور اندیشی، تنقید کے تحمل. کی صلاحیت، افراد شناسی، اور انکی قوتوں کا اندازہ کر لینا اور اسکے مطابق انھیں اختیارات سپرد کرنا، فردی اور اپنے نجی امور میں نرمی، اصولی مسائل میں سختی اپنے پیرووں کی شخصیت کو اجاگر کرنا اور ان کی طرف برابر متوجہ رہنا اور انکی عقلی و جذباتی اور علمی استعدادوں اور صلاحیتوں کو تربیت دینا اور انھیں ابھارنا، استبداد و ڈکیٹرشی اور اندھی تقلید کے میلان و رجحان سے پرہیز، تواضع و انکسار و فروتنی، سادگی و درویشی، وقار و متانت و سنجیدگی، تنظیم اور نظام کو بہت دوست رکھتے تھے تاکہ انسانی قوتوں کو بروئے کار لایا جائے اور اسے شکل دی جائے یہ تمام شرائط و صفات رسول اکرمؐ کی ذات اقدس میں کمال کی حد تک اور مکمل طور سے موجود تھے۔

حضرتؐ فرماتے تھے، "اگر تم تین آدمی ایک ساتھ سفر کرتے ہو تو اپنے میں ایک آدمی کو رئیس و حاکم منتخب کر لیا کرو" مدینہ کے اندر خود اپنے معاشرے میں خاص شعبے قائم کیے تھے (مثلاً منشیوں اور انشأ پردازوں کو تربیت فرمائی تھی اور) ہر گروہ کو الگ الگ ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ چند آدمی کاتبانِ وحی کی حیثیت سے تھے جو قرآن کو لکھ لیا کرتے تھے۔ ایک گروہ خصوصی خطوط کتابت کے لیے مقرر تھا، کچھ لوگ لوگوں کے عقدوں اور معاملات کو لکھا کرتے تھے، ایک جماعت صدقات و مالیات کا حساب و کتاب لکھتے تھے کچھ لوگ عہد ناموں اور اقرار ناموں کے ذمہ دار تھے، "تاریخ کی کتابوں از قبیل "تاریخ یعقوبی"، "التنبیہ والاشراف" مسعودی "معجم البلدان"

بلاذری اور "طبقات" ابن سعد وغیرہ میں یہ ساری باتیں موجود ہیں۔

تبلیغ کی روش اور اس کا طریقہ !

اسلام کی تبلیغ کے سلسلہ میں سہولت پسند و سہل گیر یعنی نرمی کا راستہ اختیار کرنے والے تھے، نہ کہ سخت گیر، خوف اور تہدید کے بجائے زیادہ تر بشارت و خوشخبری کے ذریعہ دعوت دیتے تھے، اپنے اصحاب میں سے ایک شخص کو تبلیغ اسلام کی غرض سے یمن بھیجا تو انھیں حکم دیا کہ،

"یسّر ولا تعسّر وبشّر ولا تنفّر" یعنی سہولت سے کام لینا، سخت گیری سے نہیں اور لوگوں کو خوشخبری دینا اور انکی خواہش و رغبت و شوق کو ابھارنا، انھیں متنفر نہ کر دینا۔ خود آپؐ تبلیغ کے کام میں اکثر مشغول رہتے، چنانچہ طائف کا سفر کیا، حج کے زمانہ میں دباہر سے آئے ہوئے، قبائل کے درمیان تشریف لے جاتے اور تبلیغ فرماتے تھے، ایک مرتبہ حضرت علی علیہ السلام کو اور پھر دوبارہ معاذ بن جبل کو لوگوں کی تبلیغ کے واسطے یمن بھیجا، مدینہ ہجرت فرمانے سے پہلے مصعب بن عمیر کو مدینہ والوں میں تبلیغ کرنے کیلئے بھیجا، اپنے بہت زیادہ اصحاب کو حبش بھیجا جنھوں نے مکّہ والوں کے ظلم وایذا رسانی سے نجات حاصل کرنے کے ضمن میں ملک حبش میں دین کی تبلیغ بھی کی اور بادشاہ حبش نجاشی اور وہاں کی تقریباً آدھی آبادی کے اسلام لانے کے لیے زمین ہموار کی اور موقع فراہم کیا۔ چھٹی ہجری میں دنیا کے بادشاہوں کو خطوط روانہ فرمائے جن میں اپنی نبوّت و رسالت کی انھیں خبر دی اور دین اسلام کی طرف دعوت دی، ان میں سے تقریباً ایک سو (۱۰۰) خطوط کی نقلیں اب بھی موجود ہیں جو آپ نے مختلف اشخاص کو تحریر فرمائے تھے۔

علم کی تشویق و ترغیب

آپ لوگوں کو تحصیل علم کا شوق دلاتے تھے، اپنے اصحاب کے بچوں کو آمادہ کیا کہ وہ علم حاصل کریں اپنے کئی اصحاب کو حکم دیا کہ وہ سریانی زبان سیکھیں، آپ فرماتے تھے "علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض و واجب ہے" نیز فرمایا ہے کہ " (حکمت مومن کا گم شدہ مال ہے) حکمت کو جہاں اور جس شخص کے پاس پاؤ اگرچہ وہ مشرک اور منافق ہی اس کو حاصل کرو"
نیز فرمایا ہے کہ "علم کو تلاش کرو اگرچہ تمہیں اسکے لیے ملک چین تک کا سفر بھی کرنا پڑے"۔
طلب و تحصیل علم کے بارے میں حضرتؐ کی یہ تاکید اور تشویق و ترغیب اسکا سبب بنی کہ مسلمان ہمت و حوصلہ کے ساتھ بے نظیر سرعت و تیزی سے تمام دنیا میں علم کی جستجو اور اسکی تحصیل میں مشغول ہو گئے۔ جہاں جہاں علمی آثار پائے انہیں حاصل کیا۔
انکے ترجمے کئے اور خود تحقیق میں مصروف ہو گئے اور اس طریقے سے۔ علاوہ اس کے کہ یونانی، رومی، ایرانی، مصری اور ہندی وغیرہ قدیم تمدنوں اور یورپی جدید تمدن کے درمیان باہمی رابطہ کا حلقہ بن گئے۔ خود تاریخ بشریت میں شاندار اور باوقار تمدن پیدا کر دیا جو "اسلامی تمدن و ثقافت" کے نام سے پہچانا گیا اور اب بھی پہچانا جاتا ہے۔ آپ کے اخلاق اور خصائل، آپکے کلام اور آپ کے دین کے مانند جامع اور ہمہ جہتی تھے۔ تاریخ آپ کے مثل کسی ایسی شخصیت کو پیش نہیں کر سکی ہے اور نہ ہرگز پیش کر سکتی جو تمام انسانی صفات و فضائل و خصائل و اخلاق میں اوج کمال کو پہنچا ہوا ہو۔ آنحضرتؐ حقاً و حقیقۃً انسان کامل تھے۔ تمام شد۔ والحمد للہ رب العالمین و صلی اللہ علی محمدؐ و آلہ الطاہرین۔

سازمان تبلیغات اسلامی کی اردو مطبوعات

۱۔ توضیح المسائل (مجلد) آیۃ ا... العظمیٰ امام خمینی ۳۵۰ ریال
۲۔ توضیح المسائل (غیر مجلد) 〃 〃 〃 〃 〃 ۲۷۰ 〃
۳۔ نہج البلاغہ (آئین زندگی) آیۃ ا... العظمیٰ منتظری ۲۰۰ 〃
۴۔ اقتصادنا (اسلامی اقتصادیات اور جدید اقتصادی مکاتب) شہید محمد باقر الصدر ۳۱۰ 〃
۵۔ آج کا انسان اور اجتماعی مشکلات۔ شہید سید محمد باقر الصدر ۵۵ 〃
۶۔ اسلامی جمہوری کا دستوری ڈھانچہ 〃 〃 〃 〃 ۵۰ 〃
۷۔ اسلامی اقتصادیات کا جائزہ 〃 〃 〃 〃 ۱۰۰ 〃
۸۔ ختم نبوت استاد شہید مطہری ۵۰ 〃
۹۔ شہید 〃 〃 〃 ۴۵ 〃
۱۰۔ اسلام اور علم 〃 〃 〃 ۱۵ 〃
۱۱۔ سچی کہانیاں (جلد اول) 〃 〃 〃 ۲۲۰ 〃
۱۲۔ تقلید کیا ہے؟ آیۃ ا... مشکینی ۳۰ 〃
۱۳۔ مغربی تمدن کی ایک جھلک۔ سید مجتبیٰ موسوی لاری ۱۵۰ 〃
۱۴۔ انقلاب اسلامی بداخلاقی کے خلاف مہم۔ محمد علی تسخیری ۴۰ 〃
۱۵۔ قرآن کی روشنی میں بین الاقوامی تعلقات۔ 〃 〃 〃 ۴۵ 〃
۱۶۔ صلح اور جنگ اسلامی نقطہ نظر سے۔ 〃 〃 〃 ۷۰ 〃
۱۷۔ خاشعین کی نماز۔ شہید دستغیب ۱۰۰ 〃
۱۸۔ معاد۔ (قیامت) 〃 〃 ۱۵۰ 〃
۱۹۔ اہلبیت اطہارؑ کی مختصر سوانح حیات۔ عقیقی بخشائشی ۱۶۰ 〃

۲۰۔ امام جعفر صادقؑ، پیشوا و رئیس مذہب۔ عقیقی بخشائشی۔ ۳۱۰ ریال
۲۱۔ اسلامی انقلاب اور اقوام عالم کا مستقبل۔ مسیح مہاجری۔ ۱۳۰ 〃
۲۲۔ اسلامی تحریک کا آغاز۔ شہید محمد جواد باہنر ۴۰ 〃
۲۳۔ ۱۵ خرداد (اسلامی انقلاب کا خونین آغاز) سازمان تبلیغات اسلامی ۵۰ 〃
۲۴۔ بیت المقدس تاریخ کے آئینے میں۔ 〃 〃 〃 〃 ۶۵
۲۵۔ دعائے کمیل۔ 〃 〃 〃 ۳۰ 〃
۲۶۔ مجاہد اسلام شہید نواب صفوی۔ مجلہ سروش ۱۸۰ 〃
۲۷۔ اسلام میں خواتین کے حقوق (زیر طبع) استاد شہید مطہری
۲۸۔ اسلامی تصور کائنات کی تمہید، وحی و نبوت 〃 〃 〃
۲۹۔ ہجرت و جہاد 〃 〃 〃
۳۰۔ فلسفۂ اخلاق 〃 〃 〃
۳۱۔ استعاذہ (اللہ تعالیٰ کے حضور پناہ طلبی) 〃 〃 شہید دستغیب
۳۲۔ اسلام میں تعلیم و تربیت (زیر طبع) استاد شہید مطہری
۳۳۔ فطرت 〃 〃 〃 〃
۳۴۔ حق اور باطل 〃 〃 〃 〃
۳۵۔ سچی کہانیاں (جلد دوم) 〃 〃 〃 〃
۳۶۔ شناخت 〃 〃 〃 〃
۳۷۔ معاشرہ اور تاریخ 〃 〃 〃 〃